محبانِ قوم و وطن

محبّانِ قوم و وطن

مرتّبہ

سلطان محمود غزنوی، بی۔ اے، بی ٹی، ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول امرتسر

و

محمد عنایت خاں حیرت مدیر "سروش" امرتسر

پبلشر

قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور

بار اوّل　　مئی ۱۹۲۹ء　　قیمت ۸/
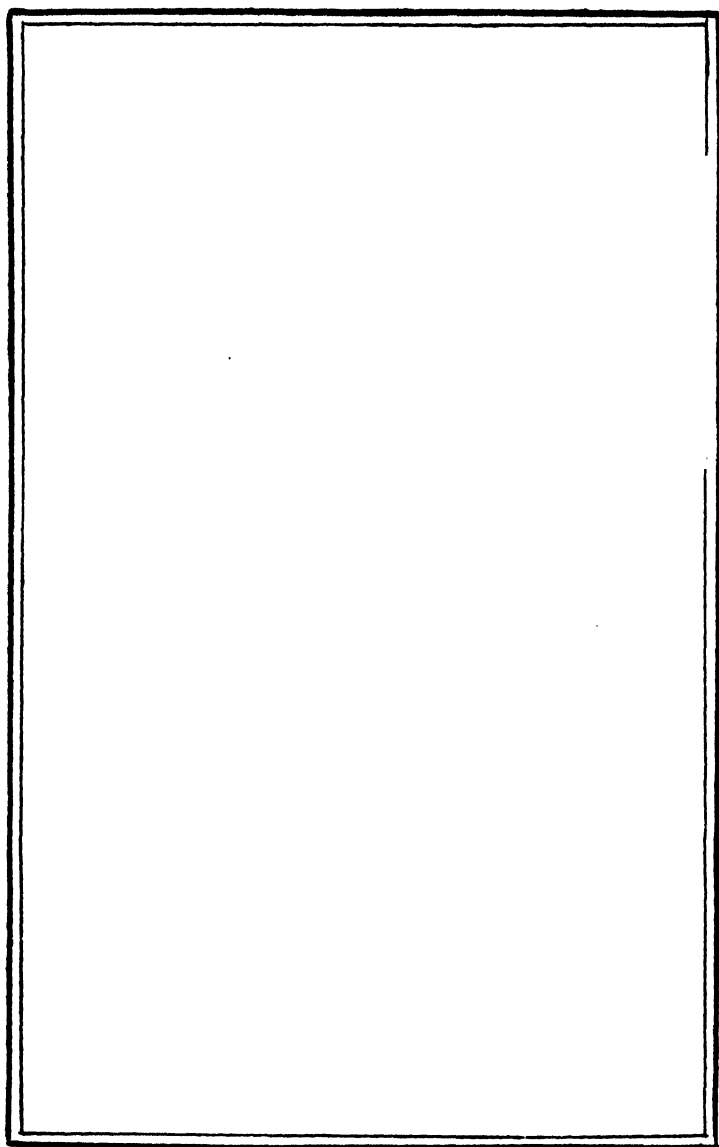
فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۳	ڈاکٹر انصاری	۹۰
۱۴	پنڈت برج نرائن چکبست	۹۳
۱۵	پنڈت رتن ناتھ سرشار	۹۵
۱۶	نواب محسن الملک	۹۸
۱۷	حکیم اجمل خاں مرحوم	۱۰۷
۱۸	سر علی امام	۱۱۵
۱۹	سر جگدیش چندر بوس	۱۲۰
۲۰	پنڈت جواہر لعل نہرو	۱۲۸
۲۱	مسٹر محمد علی جناح	۱۳۲

اتحاد پریس پل روڈ لاہور میں باہتمام شیخ امین الدین پرنٹر چھپا اور
محمد نصیر ہمایوں نے قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور سے شائع کیا۔

سرسیّد احمد خاں مرحوم

سرسید احمد خاں ۱۷ ؍ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ باپ کی طرف سے ان کا سلسلہ نسب آنحضرت صلعم تک پہنچتا ہے۔ ان کے باپ میر تقی نام ایک آزاد طبیعت انسان تھے۔ اور اکبر شاہ کے عہدِ حکومت میں ان کے خاص درباریوں میں سے تھے ؛

سرسید کے نانا خواجہ فرید الدین احمد، خواجہ محمد یوسف ہمدانی کی اولاد میں سے تھے۔ جو تجارت کے سلسلہ میں دہلی آئے۔ اور وہیں سکونت اختیار کر لی، خواجہ فرید اپنے خاندان میں سب سے زیادہ لایق اور دانشمند بزرگ تھے علم ریاضی میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ علم ہیئت اور آلاتِ رصد کے موضوع پر انہوں نے متعدد رسالے لکھے۔ جن میں سے اب بھی دو تین رسالے مدرسۃ العلوم علیگڈھ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ وہ آصف الدولہ کے بعد سعادت علی خاں کے عہدِ حکومت میں متعدد عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۸۱۵ء میں اکبر شاہ ثانی نے ان کو خلعتِ وزارت اور "دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ" کا خطاب دیا۔ چند سال وزارت کا کام انجام دے کر مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ایک معقول رقم بھیج کر ان کو لاہور میں بلایا۔ لیکن انہوں نے رقم واپس کر دی اور لاہور نہ گئے، انہوں نے ۱۸۸۲ء میں وفات پائی ؛

سرسید کی والدہ ایک لائق خاتون تھیں ۔ صرف قرآن مجید اور چند ابتدائی فارسی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں ۔ مگر تربیت اولاد کی خداداد قابلیت انکی طبیعت میں موجود تھی ۔ سرسید نے ابتدا میں قرآن مجید پڑھا ۔ پھر اس عہد کے ایک بزرگ عالم مولوی حمید الدین سے کریما ۔ خالق باری ۔ آمدنامہ وغیرہ کتب پڑھیں ۔ عربی میں شرح ملا ، شرح تہذیب ، مختصر معانی اور مطول پڑھیں ۔ اور اپنے ماموں نواب زین العابدین خاں سے اقلیدس کے چند مقالے ۔ علم ہیئت میں شرح چغمینی اور متوسطات کا ایک آدھ رسالہ پڑھا ۔ پھر آلات رصد کا شوق غالب آیا اور اپنے ماموں سے آلات رصد پر جندری ، اعمال کرہ ، اعمال اصطرلاب ، جریب الساعۃ اور پرکار تقسیم وغیرہ رسالے پڑھے ۔ اسی دوران میں طب کا شوق ہوا ۔ اور حکیم غلام حیدر خاں ایک خاندانی طبیب سے علم حکمت کی چند کتابیں پڑھیں ؛

سرسید کا عنفوان شباب زندہ اور رنگین صحبتوں کا آئینہ دار تھا ۔ وہ راگ رنگ کی تمام مجلسوں میں شریک ہوتے تھے ۔ اس وقت اگرچہ ان کی عمر ۱۷ - ۱۸ سال کی تھی ۔ مگر انہوں نے اپنے آپ کو ان صحبتوں کے اثر سے پوری احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھا اور یہ ان کی زندگی کا عبرت آموز کارنامہ ہے ؛

سنہ ۱۸۳۸ء میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا ۔ اس وقت ان کی عمر بائیس سال کے قریب تھی ۔ قلعہ سے باپ کو کئی جگہ سے تنخواہ کی صورت میں رقمیں ملتی تھیں ۔ جو انتقال کے بعد بند ہو گئیں ۔ لیکن تھوڑا سا وظیفہ سرسید کی والدہ کے نام جاری رہا ۔ اسلئے اب وہ ملازمت کی جستجو میں تھے ۔ مولوی خلیل اللہ خاں

صدر امین دہلی نے ان کو اپنی کچہری میں سر رشتہ دار مقرر کر دیا مسٹر رابرٹ ہملٹن دہلی کے جج سرسید کو پہلے سے جانتے تھے جب وہ آگرہ کے کمشنر مقرر ہوئے۔ تو ۱۸۳۹ء میں سرسید کو آگرہ میں بلا کر کمشنری کے دفتر کا نائب منشی بنا دیا۔ ان دنوں سرسید نے ایک فارسی فہرست "جام جم" کے عنوان سے مرتب کی جس میں امیر تیمور صاحبقران سے لے کر ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ تک ۴۳ مختلف بادشاہوں کے مختصر حالات قلمبند کئے۔ یہ فہرست ۱۸۴۰ء میں شایع ہوئی ۔

انہی دنوں میں انہوں نے منصفی کے متعلق دیوانی قانون کا ایک خلاصہ تیار کیا۔ جو کمشنر نے گورنمنٹ میں پیش کیا۔ اور ان کے لئے منصفی کی سفارش کی۔ عین موقع پر منصفی کے امتحان کا دستور جاری ہو گیا۔ انہوں نے امتحان دے کر منصفی کا ڈپلومہ حاصل کر لیا۔ دسمبر ۱۸۴۱ء میں وہ مین پوری کے منصف مقرر ہوئے۔ ۱۰ر جنوری ۱۸۴۲ء کو وہاں سے تبدیل ہو کر فتح پور سیکری میں آ گئے اور وہاں چار سال تک رہے ۔

۱۲۵۲ھ میں "جلاء القلوب بذکر المحبوب" ایک رسالہ شایع کیا جس میں آنحضرت صلعم کی پیدائش۔ وفات اور معجزات کا بیان تھا۔ ۱۲۶۰ھ میں "تحفہ حسن" لکھا۔ ۱۸۴۴ء میں "تسہیل فی جر الثقیل" شایع کیا۔ جو بو علی کے "معیار العقول" کا اردو ترجمہ ہے۔ اس سنہ میں حکیم احسن اللہ خاں کی تحریک پر بادشاہ نے ان کو "جواد الملک سید احمد خاں عارف جنگ" کا خطاب دیا۔ ۱۸۴۶ء میں فتحپور سیکری سے دہلی میں تبدیل ہو گئے اس وقت

ان کی عمر انتیس سال کی تھی۔ ۱۸۵۴ء تک وہ دہلی میں رہے اور وہاں کے مشہور واعظ مولوی نوازش علی سے فقہ کی چند کتابیں پڑھیں۔ اور مولینا مخصوص اللہ خاں سے علم حدیث پڑھ کر قرآن مجید کی سند حاصل کی۔ اب انہوں نے دہلی کی عمارات کے حالات کتاب کی شکل میں شایع کرنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت مولینا امام بخش صہبائی اکثر ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ ڈیڑھ سال کی انتہائی کاوش اور جد وجہد کے بعد انہوں نے "آثار الصنا دید" کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں شایع کیا۔ جس میں چار باب ہیں۔ تین باب بیرون شہر لال قلعہ اور شاہجہان آباد کی عمارتوں پر مشتمل ہیں۔ جن میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی عمارتوں کا بیان، ان کے نقشے اور کتبے درج ہیں۔ چوتھے باب میں مشاہیر دہلی کا تذکرہ ہے۔ ۱۸۵۴ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شایع ہوا۔ ۱۸۶۱ء میں فرانس کے مشہور اورینٹیاسٹ موسیو گارسن آتاسی نے اس کا فرانسیسی ترجمہ کیا۔ اور سر سید کو بھی ایک نسخہ بھیجا۔ اس پر لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے ان کو سوسائٹی کا اعزازی فیلو منتخب کیا۔

۱۸۴۹ء میں رسالہ "کلمۃ الحق" تالیف کیا۔ یہ پیری مریدی اور بیعت مروجہ کے خلاف تھا۔ ۱۸۵۰ء میں رسالہ "راہ سنت در رد بدعت" لکھا۔ ۱۸۵۲ء میں "سلسلۃ الملوک" مرتب کیا۔ جس میں ان راجاؤں اور بادشاہوں کی فہرست ہے۔ جو پانچ ہزار سال سے دہلی میں حکومت کرتے چلے آرہے تھے اور یہ سلسلہ ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند پر آکر ختم کیا ہے۔ ۱۸۵۳ء میں "کیمیائے سعادت" مصنفہ غزالی مرحوم کے چند ابتدائی اوراق کا ترجمہ کیا۔ ۱۸۵۷ء میں وہ بجنور کے

مستقل صدرامین مقرر ہوکر دہلی سے تبدیل ہو گئے۔ اور ابھی سوا دو سال ہی گذرے تھے کہ غدر ہو گیا۔ اس قلیل عرصہ میں انہوں نے تاریخ بجنور مرتب کی اور آئین اکبری کی تصحیح و تکمیل کی۔ جس کی دو جلدیں تو غدر سے پہلے پہلے شایع ہو گئیں۔ اور تیسری جلد کی اشاعت کے دوران میں غدر ہو گیا۔ اور اس کا مسودہ اور دیباچہ سب کے سب تلف ہو گئے۔ اس وقت پہلی اور تیسری جلد مطبوعہ ۱۲۷۲ھ کہیں کہیں موجود ہے۔ ۱۲۷۲ھ تک اس کے متعدد فرانسیسی اور انگریزی ترجمے ہوئے۔ سرسید کا یہ ایک بڑا احسان تھا۔ کہ انہوں نے ایک نامور مسلمان بادشاہ کے کارنامے حسین و جمیل رعنائیوں کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کئے +

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی میں بغاوت ہوئی۔ ۱۲ مئی کو یہ خبر برقی رو کی طرح بجنور میں پہنچ گئی۔ اس وقت بیس یورپین اور یوریشین اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ بجنور میں مقیم تھے۔ سرسید نے ان کے بچانے کے لئے جو جو مصائب برداشت کیں۔ وہ نہایت دردناک ہیں۔ اور ان کے مطالعہ سے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ "تاریخ سرکشی بجنور" میں ان کا مفصل ذکر ہے چنانچہ سرسید کی حسن تدبیر اور نیکدلی سے تمام یورپین اور عیسائی مرد وزن اور بچے صحیح سلامت رڑکی میں پہنچ گئے۔ ان میں مسٹر شکسپیر کلکٹر مجسٹریٹ بجنور اور ان کی بیوی بھی تھیں +

اب سرسید کو اس بات کی فکر لاحق ہوئی۔ کہ وہ کسی نہ کسی طرح میرٹھ پہنچ جائیں۔ کیونکہ بجنور میں باغیوں نے قیامت برپا کر رکھی تھی جو جس کے ہاتھ

آجاتا تھا۔ بید ریغ قتل کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ وہ ہلدور پہنچے اور وہاں سے راتوں رات پیادہ پا میرٹھ کی طرف چل دیئے۔ پلانہ کی سرحد پر دو ہزار مسلح گنوار ان کے قتل کے ارادہ پر دوڑے۔ لیکن ابھی ان کو قوم کی کچھ خدمت کرنا تھی۔ وہاں سے بچ نکلے اور چاندپور پہنچے۔ یہاں ہزاروں مسلح باغیوں نے ان کو گھیر لیا۔ یہاں میر صادق علی خاں رئیس چاندپور کی سعی حسنہ سے بچ کر موہلہ کے گاؤں میں پہنچے جہاں چند روز مولوی محمود عالم خاں کے مکان پر رہے۔ اور اپنی مفصل سرگذشت انگریزی حکام کو لکھ کر بھیج دی۔ چند روز کے بعد انتہائی مصائب برداشت کرتے ہوئے میرٹھ پہنچ گئے۔ اس وقت ان کی جیب میں چھ پیسے اور ایک پھٹا ہوا کرتہ تھا۔ جو انہوں نے پہنا ہوا تھا۔ پانچ ماہ تک میرٹھ میں رہے۔ یہاں ان کو معلوم ہوا۔ کہ سرکاری فوج کے سپاہیوں نے ان کا گھر بار لوٹ لیا ہے۔ اور ان کے ماموں وحید الدین خاں اور ماموں زاد بھائی ہاشم علیخاں کو قتل کر دیا ہے۔ اب ان کی والدہ اور خالہ ہی دہلی میں ہیں۔ اور گھر بار لٹنے کے بعد جلوخانہ کی ایک کوٹھڑی میں چلی آئی ہیں۔ سرسید کو دہلی پہنچکر معلوم ہوا۔ کہ دونوں کو تین دن سے فاقہ ہے۔ اور دو دن سے پانی کا ایک قطرہ میسر نہیں آیا۔ سرسید نے اس ہنگامہ عظیم میں ایک شکرم مہیا کی اور والدہ کو میرٹھ میں لے آئے۔ وہ کچھ دن بیمار رہ کر یکم ربیع الثانی ۱۲۷۴ھ کو انتقال کر گئیں۔

۱۶ر فروری ۱۸۵۸ء کو گورنمنٹ سکرٹری کی ایک چٹھی مسٹر شکسپیئر کو ملی۔ کہ عملہ سمیت رڑکی پہنچ جاؤ۔ سرسید بھی ان کے ہمراہ گئے۔ انگریزوں کے

چلے جانے کے بعد بجنور میں خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ کبھی ہندوؤں نے مسلمانوں پر اور کبھی مسلمانوں نے ہندوؤں پر یورش کی ۔ آخر کار محمود خاں سب پر غالب آیا۔ کچھ ہندو رئیس شکست کھا کر میرٹھ چلے آئے۔ اور باہمی خانہ جنگیوں کو سرکار کی خیر خواہی پر محمول کرنے لگے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان باغی قرار دیئے جائیں۔ مگر سرسید نے شکسپیئر سے کہا۔ کہ سرکار کے نزدیک ان لوگوں کو باغی قرار دیا جائے۔ جو اس وقت سرکار سے مقابلہ کریں۔ اس سے پہلے رعایا نے ایک دوسرے سے جو لڑائیاں کی ہیں۔ ان کی نسبت کچھ بھی تجویز ہو۔ مگر ان کی بنا پر کسی کو باغی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ آخر کار یہ بات قرار پا گئی۔ کہ انگریزی فوج کا مقابلہ کرنے والے باغی قرار دیئے جائیں۔ بدقسمتی سے آم سوت نجیب آباد اور نگینے میں کچھ لوگوں نے مقابلہ کیا۔ اور سرکاری افسروں کو بدظن کر دیا +

سرسید نے اس موقع پر باغیوں کی مطلق حمایت نہیں کی۔ لیکن ان لوگوں کے بچاؤ کی سر توڑ کوشش کی۔ جو کسی دباؤ یا باہمی خانہ جنگی کی بنا پر مجرم قرار دیئے گئے تھے۔ یا جنہوں نے ذاتی طور پر سرسید کو تکلیف دی تھی۔ حالانکہ ضلع بجنور کا نظم و نسق سرسید کے سپرد تھا۔ اور یہاں کے ہندو مسلم فسادات یادگار غدر ہیں اگر اس وقت بجنور کا انتظام کسی دوسرے کے سپرد ہوتا۔ تو بجنور میں کوئی انسانی ہستی زندہ نہ رہتی۔ لیکن سرسید کی بدولت یہ ضلع غدر کی تباہی سے محفوظ رہا۔ اگرچہ سرسید کی خدمات ہر قسم کے انعامات و اکرامات سے مبرا تھیں۔ مگر حکومت نے اس صلہ میں ان کو ایک ہزار روپیہ کی ایک خلعت اور دو صد روپیہ ماہوار کی سیاسی پنشن دو نسلوں تک مقرر کر دی +

۱۸۵۸ء میں وہ صدر الصدور کے عہدہ پر بجنور سے مراد آباد گئے۔
۱۸۵۹ء میں جب ضبط شدہ جائدادوں کی تحقیقات کے لئے ایک سپیشل کمیشن بیٹھا۔ تو سرسید اس کے ہندوستانی ممبر مقرر ہوئے۔ اور اپنے عہدہ کے علاوہ دو سال تک اس کام کو بھی انجام دیتے رہے۔ سرسید کی شرکت کی وجہ سے جس قدر ضبط شدہ جائدادیں ضلع مراد آباد میں واگذار ہوئیں وہ کسی دوسرے ضلع میں نہیں ہوئیں۔ سرسید نے مراد آباد میں "تاریخ سرکشی بجنور" شایع کر دی اس میں ۱۸۵۷ء سے اپریل ۱۸۵۸ء تک کے وہ واقعات غدر بیان کئے گئے تھے۔ جو بجنور کے ضلع میں گذرے۔ ۱۸۵۹ء میں انہوں نے مراد آباد میں ایک فارسی مدرسہ قایم کیا۔ مگر جب مسٹر اسٹریچی یہاں کلکٹر ہو کر آئے۔ اور انہوں نے یہاں ایک تحصیلی درسگاہ قایم کی۔ تو فارسی مدرسہ کے طلبہ بھی اس میں داخل ہو گئے۔

مراد آباد میں سرسید نے حکومت، وطن اور قوم کی یادگار زمانہ خدمات انجام دیں۔ ضلع بجنور کے مسلمانوں کی بربادی کا نظارہ ان کے پیش نظر تھا۔ لیکن مراد آباد میں ان کی تباہی دیکھ کر سرسید کے دل پر دوسری ضرب لگی۔ گورنمنٹ کا عتاب مسلمانوں پر بدستور موجود تھا۔ اور ان کا مسلمان ہونا ہی اس بات کی دلیل تھا۔ کہ وہ مجرم ہیں۔ انہوں نے بغاوت ہند کے اسباب و علل پر ایک رسالہ لکھا۔ جس میں ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کو۔ جو انگریزوں کی بدگمانی کا تختۂ مشق بنے ہوئے تھے۔ بغاوت کے الزام سے بری قرار دیا۔ ۱۸۵۹ء میں یہ رسالہ پانچ سو کی تعداد میں شایع ہوا۔ انہوں نے

ایک جلد گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیجی - کچھ نسخے اپنے پاس رکھے - اور کچھ کم پانصد کا پارسل ولایت روانہ کر دیا - جب یہ کتاب انگریزی میں ترجمہ ہو کر کونسل میں پیش ہوئی تو لارڈ کیننگ گورنر جنرل اور سر بارٹر فریر رکن کونسل نے اس کو خیر خواہی پر محمول کیا - مگر معتمد خارجہ (فارن سکرٹری) نے اس کے خلاف زبردست تقریر کی اور اس کو باغیانہ قرار دیتے ہوئے مصنف سے باز پرس کئے جانے کی سفارش کی مگر اس کا کچھ اثر نہ ہوا +

۱۸۶۰ء میں شمال مغربی اضلاع ہند میں ایک عام قحط پڑا - سر سید ان دنوں مراد آباد کے صدر الصدور تھے - اور مسٹر اسٹریچی کلکٹر تھے - انہوں نے ضلع کے قحط کا مجموعی انتظام سر سید کے سپرد کر دیا - انہوں نے اس موقع پر جو انسانی ہمدردی ظاہر کی - وہ ابد الآباد تک یادگار رہے گی - اور یہ اسی نیکی اور بھلائی کا ثمرہ تھا - کہ تمام ہندوستان میں سر سید کی عزت افزائی ہوئی - ان کا حسن انتظام ملاحظہ ہو - کہ چودہ ہزار محتاجوں کو ایک گھنٹہ میں کھانا تقسیم کر دیا جاتا تھا - شفاخانے اور ڈاکٹر موجود تھے - ہندوؤں کے لئے ہندو اور مسلمانوں کے لئے مسلمان باورچی تھے - پردہ نشین عورتوں کے لئے خاص انتظام تھا - مراد آباد کے لوگ بیان کرتے ہیں - کہ اس زمانہ کی عورتیں آخری دم تک سر سید کو دعائیں دیتی ہیں +

۱۸۶۱ء میں سر سید کی بیوی کا انتقال ہو گیا - ان کے بطن سے دو بیٹے سید حامد - سید محمود اور ایک چھوٹی لڑکی تھی - اس وقت سر سید کی عمر چوالیس سال کی تھی - جسمانی صحت بہت اچھی تھی - ان کے دوستوں نے دوسری شادی کے لئے بہت مجبور کیا - مگر چھوٹے بچوں کی پرورش کا خیال

اور قومی خدمت کے جذبات نے ان کو ایسا کرنے سے روکا۔ اور انہوں نے اپنی ساری عمر تجرد اور پارسائی میں گذار دی۔ ۱۸۶۲ء کو ان کی تبدیلی مرادآباد سے غازی پور ہوگئی۔ اسی سال ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے تاریخ فیروزشاہی ضیائی برنی شائع کی۔ جو سرسید نے پوری تحقیق سے درست کی تھی۔

اب سرسید کو خیال ہوا۔ کہ مسلمان جو انگریزی تعلیم سے متنفر ہیں۔ اور ہندو جو اس کو نوکری کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ دونوں کے دل انگریزی تعلیم سے روشناس کئے جائیں۔ تاکہ ان کو انگریزی علم و ادب کا ذوق پیدا ہو۔ اور انگریزوں اور ہندوستانیوں میں رابطہ اتحاد پیدا ہو۔ چنانچہ انہوں نے ۱۸۶۲ء میں غازی پور میں ایک سائنٹیفک سوسائٹی قایم کی۔ جس کے پیٹرن ڈیوک آف آرگائل وزیر ہند ہوئے۔ اور مسٹر ڈرامنڈ لفٹننٹ گورنر شمال مغرب (یوپی) اور مسٹر مکلوڈ لفٹننٹ گورنر پنجاب وائس پیٹرن مقرر ہوئے۔ اور متعدد رؤسا اور ہندو مسلم معززین نے اس کی رکنیت کو قبول کیا۔ اور غازی پور میں ترجمہ کا کام شروع ہوگیا۔ اس مطلب کے لئے انہوں نے کلکتہ کا سفر بھی کیا۔ ۱۸۶۴ء میں انہوں نے ایک مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ جس کی تعمیر کا کام ستر ہزار روپیہ کے سرمایہ سے شروع ہوگیا۔ ان کی ابتدائی کارروائیوں سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ اس کو ایک بڑا کالج بنانا چاہتے ہیں۔ راجہ ہر دیو نرائن سنگھ اس کے پیٹرن اور وزیر مقرر ہوئے۔ اردو۔ انگریزی۔ عربی۔ فارسی اور سنسکرت کی تعلیم کا انتظام ہوگیا۔ مگر اسی سال ان کی تبدیلی علیگڈھ ہوگئی۔ یہ سکول آجتک وکٹوریہ ہائی اسکول کے نام سے غازی پور میں جاری ہے۔ اسی سال انہوں نے رسالہ فوائد الافکار فی اعمال الفرجار

کا ترجمہ کیا۔ جو ان کے نانا دبیر الدولہ نے پرکار رتنا سبہ کے اعمال پر لکھا تھا ؛
چونکہ سرسید کی غیر حاضری میں غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی کا چلنا ناممکن تھا۔ اسلئے وہ تمام سامان اور اسٹاف اپنے ساتھ ہی لے آئے۔ اور ولیم جنکس بریل جج علیگڈھ اس کے صدر بنائے گئے اور متعدد ہندوستانی اور یوروپین اس سوسائٹی کے رکن بن گئے۔ اور تقریباً تیس ہزار کی لاگت سے سوسائٹی کے لئے ایک عظیم الشان عمارت بنائی گئی۔ سوسائٹی کے لئے پانسو روپیہ ماہوار کے تنخواہ دار ملازم مقرر کئے گئے۔ اس سوسائٹی نے بہت سی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر کے شایع کیں۔ جن میں الفنسٹن کی تاریخ ہند، ان کی تاریخ مصر قدیم اور تاریخ یونان قدیم۔ اسکاٹ برن کا رسالہ علم فلاحت۔ سرجان میلکم کی تاریخ ایران، ریورنڈ ایکس وس کی تاریخ چین، اور سنئیر کا رسالہ تاریخ مدن خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ؛

سنہ ۱۸۶۶ء میں سوسائٹی میں قریباً ۴۴ مختلف زبانوں کے اخبارات و رسائل آتے تھے۔ خود سرسید نے سوسائٹی کو پوری طرح فائدہ پہنچایا۔ اپنا آٹھ ہزار روپیہ کا مالیتی پریس سوسائٹی کو مفت دے دیا۔ سنہ ۱۸۶۶ء میں نواب سکندر بیگم مرحومہ رئیسہ بھوپال نے الماس کی ایک انگوٹھی مالیتی ایکہزار روپیہ خاص سرسید کو بھیجی جو انہوں نے سوسائٹی کو نذر کر دی ؛

اسی سال انہوں نے "علیگڈھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کے نام سے ایک جماعت قایم کی جس کا مقصد یہ تھا۔ کہ ہندوستانیوں کو گورنمنٹ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کرنا چاہیئے اس وقت

ملکہ معظمہ آنجہانی کا عہدِ حکومت تھا۔ ایسوسی ایشن نے سرسید کے قیام علیگڈھ کے زمانہ میں بہت مفید کام انجام دیئے۔ اسی سال ان کی تحریک سے زمینداران علیگڈھ نے گورنمنٹ کو ایک درخواست بھیجی۔ کہ جب مالگذاری کے علاوہ ہم سے ایک روپیہ تعلیمی خرچ کے لئے لیا جاتا ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ نظامِ تعلیم میں ہمارا دخل نہ ہو۔ ہر ضلع میں ایک تعلیمی کمیٹی قائم کی جائے۔ جس میں رؤسا اور زمیندار بھی شریک ہوں۔ چنانچہ گورنمنٹ نے اضلاع شمال مغرب میں اس قسم کی تعلیمی کمیٹیاں قایم کردیں۔ اسی سال انہوں نے سوسائٹی کی طرف سے "علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" ایک اخبار جاری کیا۔ جو ان کے آخری دم تک نکلتا رہا۔

۱۸۶۷ء میں وہ جج سمال کاز کورٹ کی حیثیت سے بنارس چلے گئے اور سوسائٹی کا سارا کاروبار راجہ جے کشن داس سی۔ ایس۔ آئی۔ ڈپٹی کلکٹر علیگڈھ کے سپرد کر گئے۔ جنہوں نے نہایت دانشمندی سے اس فرض کو انجام دیا۔ اسی سال انہوں نے ہومیوپیتھک طریق علاج کو مروج کرنے کے لئے ایک کمیٹی قائم کی۔ جس کے صدر راجہ بنارس اور معتمد سرسید ہوئے۔ اور ایک ہومیوپیتھک ڈسپنسری اور ہسپتال کھول دیا گیا۔ آج یہ طریق علاج ہندوستان میں ہر جگہ رائج ہے اور جابجا اس کے ہسپتال قائم ہیں۔

یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو سرسید بنارس سے ولایت روانہ ہوئے تاکہ انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان موانست اور دوستی پیدا ہو۔ اس سفر میں اُن کے دونوں بیٹے سید حامد اور سید محمود۔ مرزا خداداد بیگ اور ان کا قدیم خدمتگار

ساتھ تھے بنارس سے لندن تک پہنچنے کے حالات انہوں نے اپنے سفرنامہ میں تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ چوبیس دن میں وہ لندن پہنچے۔ اور سکلین برک اسکوائر میں کرایہ پر مکان لے کر ٹھہرے۔ ایک سال پانچ ماہ تک وہ لندن میں مقیم رہے۔ وہاں کے اکثر امراء، مشاہیر اور حکومت کے بالاتر افسروں سے ان کی ملاقات ہوئی۔ ۲۳ر جون ۱۸۶۹ء کو لارڈ لارنس کے ہاں ایک بڑی دعوت پر بلائے گئے۔ ۶ر اگست ۱۸۶۹ء کو انڈیا آفس میں ڈیوک آف آرگائل کے ہاتھ سے ان کو سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب اور تمغہ ملا۔ ۱۶ر نومبر ۱۸۶۹ء کو ایک بڑے جلسہ میں مدعو کئے گئے۔ ۱۱ر مارچ ۱۸۷۰ء کو ملکہ معظمہ آنجہانی کی سوی ری میں بلائے گئے۔ اسی سنہ میں پرنس آف ویلز کی سوی ری میں شامل ہوئے۔ چونکہ ان کا سب سے بڑا مقصد وہاں کے طریق تعلیم کا معائنہ کرنا تھا اس لئے انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی کا تمام نقشہ ذہن نشین کر لیا۔ ملک کی عام تعلیمی حالت۔ اور تعلیم نسواں کا مطالعہ کیا۔ اور لندن میں ایک انگریزی پمفلٹ شایع کیا جس میں ہندوستانی طریق تعلیم کے نقایص بیان کئے۔ انہوں نے یورپ کی تہذیب، طرز تمدن، حسن معاشرت اور اس کی ترقیات کے اسباب ملاحظہ کئے۔ امراء کی بود و ماند دیکھی۔ عجائب خانوں اور کتب خانوں میں جا کر اپنی علمی تحقیقات کو وسعت دی ؎

۲۲ر مارچ ۱۸۷۰ء کو دو مضمون "عذر از طرف گنہگار سید احمد" اور "عرضداشت سید احمد بخدمت اہل وطن" ہندوستان کے اخبارات میں بھیجے اُن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کے دل میں ملی و وطنی ہمدردی کے جذبات

کس قدر جوش زن ہیں۔ ۴ ستمبر ۱۸۷۰ء کو وہ لندن سے ہندوستان روانہ ہوئے ۲ اکتوبر کو بمبئی پہنچے۔ اور بنارس میں اپنے عہدہ کا چارج لیا ۔

۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو تہذیب الاخلاق کا پہلا پرچہ شایع کیا۔ جو چھ ماہ تک نکلتا رہا۔ اس میں مسلمانوں کے تمدن اور اخلاق و معاشرت کے علاوہ اس مذہبی ضمن پر بحث ہوتی تھی۔ جو مسلمانوں کی دنیوی ترقی کو مانع تھا۔ دو تین پرچے شایع ہوتے ہی اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ سر سید پر کفر کے فتوے جاری ہو گئے۔ مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ تہذیب اخلاق جاری رہا۔ اور اس نے چند سال میں مسلمانوں کے اندر وہ تحریک پیدا کر دی۔ جو صدیوں تک پیدا ہونی ناممکن تھی ۔

سر سید کا دوسرا کام مسلمانوں کی تعلیمی ترقی پر غور کرنا تھا۔ انہوں نے بنارس میں ایک کمیٹی قایم کی اور ایک اشتہار شایع کیا۔ جس میں مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے متعلق گورنمنٹ ہند کو توجہ دلائی۔ اور مسلمانوں کو اس مسئلہ پر انعامی مضامین لکھنے کی ترغیب دی۔ اس پر قریباً ۲۲ مضامین مختلف صحیفہ نگاروں کے سکرٹری کو پہنچے۔ جن میں پہلا انعام مولوی سید اشرف علی ایم۔ اے بنارس کالج۔ دوسرا نواب اختصار جنگ مولوی مشتاق حسین اور تیسرا انعام ایک اور مولوی صاحب کو ملا۔ سر سید نے ان مضامین سے ایک رپورٹ مرتب کی۔ جس سے مفصلہ ذیل نتایج اخذ کئے ۔

(۱) انگریزی تعلیم کی نسبت پرانے خیال کے مسلمانوں کا عقیدہ لغو اور بیہودہ ہے۔ (۲) ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں کی تعداد سرکاری مدارس میں

بہت کم ہے۔ (۳) سرکاری مدارس میں اپنی اولاد کو نہ بھیجنے کے خیالات کچھ ناواجب اور اکثر واجب ہیں۔ سرکاری طریقہ تعلیم مسلمانوں کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا۔ (۴) گورنمنٹ طریقہ تعلیم میں تبدیلی بھی کر دے تو مسلمانوں کی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں۔ (۵) مسلمانوں کو علوم قدیمہ کے محفوظ رکھنے، علوم جدیدہ سے مستفید ہونے اور حسب ضرورت اپنی اولاد کو تعلیم سے بہرہ ور کرنے کیلئے اپنی فکر آپ کرنی چاہیئے۔ اس رپورٹ میں مجوزہ کالج کی سکیم اور طریقہ تعلیم بھی درج تھا۔ اور اس پر شمس العلماء مولوی ذکاءاللہ صاحب کی رائے تھی۔ کہ ایجوکیشن کمیشن نے مسلمانوں کی تعلیم کے موانع وہی تسلیم کئے ہیں۔ جو ۱۸۷۲ء میں سرسید نے اپنی رپورٹ میں درج کئے تھے۔ جب یہ رپورٹ گورنمنٹ کو پہنچی۔ تو اس نے مجوزہ کالج کی امداد کا وعدہ کیا ٭

جولائی ۱۸۷۲ء میں سرسید نے ایک اشتہار شایع کیا۔ کہ مدرسۃ العلوم کا مرکز کہاں ہو۔ چنانچہ کثرت رائے سے اس کا مرکز علیگڈھ قرار پایا۔ فروری ۱۸۷۳ء میں سرسید نے ایک تعلیمی سکیم پیش کی جس کو جملہ اراکین نے پسند کیا۔ ۱۳ اگست ۱۸۷۳ء کو سب کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ اور مدرسۃ العلوم کی دوبارہ تحریک ہوئی۔ دسمبر کو پھر جلسہ ہوا اور قرار پایا۔ کہ مدرسۃ العلوم نمونۃً قایم کیا جائے۔ چنانچہ مئی ۱۸۷۵ء کو ملکہ معظمہ انجہانی کی سالگرہ کے دن مدرسۃ العلوم کی افتتاحی رسم ادا کی گئی۔ اور یکم جون ۱۸۷۵ء سے تعلیم شروع ہو گئی۔ اور ۱۸۷۶ء کے آخر میں سرسید پنشن حاصل کر کے بنارس سے علیگڈھ آ گئے۔ اور ہمہ تن کالج کے کام میں مصروف ہو گئے۔ ۱۸۷۷ء کے شروع میں کالج کا بنیادی پتھر رکھا گیا۔ اس کی افتتاحی رسم

لارڈ لٹن والئسرائے ہند کے ہاتھوں سے ادا ہوئی۔ سر سید نے مدرستہ العلوم کا کام ایسی قابلیت سے شروع کیا۔ کہ تمام روشن خیال مسلمان ان کے گرویدہ ہو گئے اور سلطنت کے جلیل القدر رکن اس کی مینجنگ کمیٹی کے ممبر بن گئے ؛

۱۸۹۱ء میں سر سید ایک ڈپوٹیشن لے کر حیدر آباد گئے۔ حضور نظام نے دو ہزار روپیہ ماہوار ہمیشہ کے لئے مقرر کر دیا۔ مدرستہ العلوم میں دو محکمے انگریزی اور السنہ شرقیہ قایم کئے گئے۔ ۱۸۷۵ء میں ابتدائی مدرسہ قایم ہوا ۱۸۷۸ء میں کالج کھول دیا گیا۔ ۱۸۸۱ء میں بی۔ اے اور ایم۔ اے تک تعلیم کا انتظام ہو گیا۔ ۱۸۸۳ء سے قانونی امتحان میں کلکتہ یونیورسٹی کے ساتھ اور سائنس اور آرٹس کی اعلےٰ تعلیم میں الہ آباد یونیورسٹی کے ساتھ کالج کا الحاق ہو گیا ؛

۱۸۷۸ء میں سر سید وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر ہوئے۔ اور چار سال تک رہے۔ اس مدت میں انہوں نے دو مسودے "چیچک کے ٹیکہ کا قانون اور قاضیوں کے تقرر کا قانون" کونسل میں پیش کئے اور دونوں پاس ہو گئے۔ اور آج تک ان پر عملدرآمد ہو رہا ہے۔ قانون ٹیکہ ۱۸۷۹ء اور قانون قضاۃ ۱۸۸۰ء میں پاس ہوئے ؛

۱۸۸۳ء میں انہوں نے "محمڈن سول سروس ایسوسی ایشن" قایم کی۔ تاکہ ولایت میں جا کر امتحان پاس کرنے کے لئے کم استطاعت لڑکوں کی امداد کی جائے۔ مگر بہت کم لوگوں نے اس طرف توجہ کی اور ایسوسی ایشن فیل ہو گئی ؛

۱۸۸۶ء میں انہوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قایم کی۔ جس کا مقصد یہ تھا۔ کہ مسلمانوں کو اعلےٰ تعلیم کی طرف متوجہ کیا جائے۔ مشرقی و دینی تعلیم کیلئے

مناسب تدابیر اختیار کی جائیں۔ دیسی مدارس کی قدیم طرز تعلیم کے حالات دریافت کئے جائیں۔ اور ان کو توسیع دی جائے۔ قرآن خوانی اور حفظ قرآن کے مدارس کو مستحکم کیا جائے۔ اس کے لئے قرار پایا۔ کہ کانفرنس کا اجلاس ہر سال ہندوستان کے مختلف مقامات میں ہُوا کرے۔ ۱۸۸۶ء سے ۱۸۹۶ء تک اس کے سالانہ اجلاس باقاعدہ ہوتے رہے۔ اور اس سے بہت مفید نتائج مترتب ہوئے ؛

۱۸۸۷ء میں لارڈ ڈفرن نے ان کو سول سروس کمیشن کا ممبر منتخب کیا۔ اس کے تمام ہندوستانی ممبر اعلےٰ درجہ کے انگریزی تعلیمیافتہ تھے۔ مگر سرسید بقدر ضرورت انگریزی سمجھ سکتے تھے۔ تاہم انہوں نے رکنیت کے فرائض نہایت قابلیت سے انجام دیئے۔ اور پیش ہونے والے قانون پر فاضلانہ بحث کی ؛

چونکہ گورنمنٹ نے سول سروس کے امیدواروں کی عمر ۲۱ کی بجائے ۱۹ برس کردی تھی۔ ۱۸۸۴ء میں بابو سریندرو ناتھ بینرجی نے ہندوستان کا دَورہ کیا۔ تاکہ اہل ہند کو گورنمنٹ سے درخواست کرنے کے لئے متوجہ کیا جائے کہ پہلی عمر بحال رکھی جائے۔ اس کے متعلق علیگڈھ میں جو جلسہ ہُوا۔ سرسید اس کے صدر تھے۔ اور اس تجویز میں برابر کے شریک تھے ؛

اسی سال بنگالیوں نے نیشنل لیگ قایم کی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ گورنمنٹ نے ہندوستانیوں سے جن حقوق کا وعدہ کیا تھا۔ وہ ان کا ایفا کرے۔ لیگ نے بہت سے رسالے مختلف زبانوں میں شایع کرکے ہندوستان میں تقسیم کئے۔ جن میں موجودہ طریق انتظام پر سختی سے تبصرہ کیا گیا۔ ۱۸۸۵ء میں سرسید نے بنگالیوں کی شرکت کو نقصان دہ قرار دیا

تاہم اعلانیہ کانگرس کی مخالفت نہیں کی۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے ہمیشہ خواہشمند رہے۔ اگرچہ ہندو سبھاؤں نے اردو اور فارسی رسم الخط کی انتہائی مخالفت کی۔ مگر جب انہوں نے دیکھا۔ کہ کانگرس مسلمانوں کے سیاسیات کو صدمہ پہنچا رہی ہے۔ تو انہوں نے ۱۸۸۷ء کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دوم منعقدہ لکھنؤ میں کانگرس کے خلاف ایک مبسوط تقریر کی۔ ان دنوں کانگرس کا اجلاس سوم مدراس میں ہو رہا تھا۔ ۱۸۸۸ء میں انہوں نے میرٹھ میں ایک اور تقریر کی۔ کہ کانگرس نے اخبارات میں مشہور کر رکھا ہے کہ مسلمان عام طور پر کانگرس کے حامی ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ جن معدودے چند مسلمانوں نے اس میں شرکت کی ہے۔ انہوں نے غلطی کی ہے۔ اسی سال انہوں نے پیٹریاٹک ایسوسی ایشن اس مقصد کے لئے قایم کی۔ کہ جو رؤسا۔ تعلقہ دار اور قومیں کانگرس میں شریک نہیں ہیں۔ ان کے خیالات انگریزی میں شایع کر کے اہل انگلینڈ اور پارلیمنٹ کے اراکین کو ولایت میں بھیجے جائیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ بنگال۔ بہار۔ مدراس بمبئی۔ ممالک متوسط شمال مغرب اودھ اور پنجاب کی اسلامی مجالس نے کانگرس کی زبردست مخالفت کی۔ اور پارلیمنٹ کو یقین دلا دیا۔ کہ مسلمان خصوصاً اور ہندوستان کی دوسری قومیں عموماً کانگرس میں شریک نہیں ہیں۔ اس موقع پر سرسید کی بڑی مخالفت کی گئی۔ مگر وہ اخیر دم تک اس پر قایم رہے۔ اسی سال ان کو نائب کمانڈر طبقہ اعلےٰ ستارۂ ہند کا اعزاز دیا گیا۔ ۱۸۸۹ء میں اڈنبرا یونیورسٹی نے ان کو ایک اعلیٰ مصنف اور حامی علوم ہونیکے لحاظ سے ایل۔ ایل۔ ڈی۔ کی

ڈگری دی ؂

۱۸۹۵ء میں مدرسۃ العلوم علیگڈھ کا ہیڈ کلرک انگریزی دفتر شام بہاری لال جو ۱۸۸۳ء سے اس عہدہ پر مامور تھا۔ ۶۲ ہزار روپیہ زر امانت اور بیالیس ہزار پانسو ستر روپیہ مزید بنک سے وصول کرکے خورد برد کرگیا جس سے کالج کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ اور سرسید اسی غم میں ختم ہوگئے انہی ایام میں اُردو اور فارسی رسم الخط کے خلاف پھر جھگڑا اُٹھا۔ سرسید نے اپنی موت سے ایک ہفتہ قبل اپنی قدیم رائے سے گورنمنٹ کو متوجہ کیا۔ اور الہ آباد کی قائم کردہ کمیٹی سے خط وکتابت کی۔ کہ معاً ایک عیسائی رسالہ "امہات المومنین" اسلام کے خلاف شایع ہوا۔ جس میں آنحضرت صلعم کی کثرت ازدواج اور آپ کے اخلاقِ حمیدہ پر دریدہ دہنی سے اعتراض کئے گئے تھے۔ سرسید نے اس کا جواب لکھنا شروع کیا۔ جو ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا۔ کہ ۲۴ مارچ ۱۸۹۸ء کو احتباس البول کا مرض لاحق ہوگیا۔ علیگڈھ کے سول سرجن پوری توجہ سے علاج کرتے رہے۔ میرٹھ کے مشہور میڈیکل آفیسر کو بھی مشورہ کے لئے بلایا گیا۔ مگر چونکہ وقت ختم ہوچکا تھا۔ کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ ۲۶ مارچ کی شام کو علامات نے خطرناک صورت اختیار کرلی۔ ۲۷ کی صبح سے سخت دردِ سر شروع ہوگیا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ دورانِ خون میں یورک ایسڈ شامل ہوکر دماغ کو متاثر کررہا ہے۔ اسی دن شام کو شدید لرزہ سے بخار ہوگیا۔ اور ہذیان کی صورت پیدا ہوکر تین گھنٹے تک انتہائی بے چینی رہی۔ اور رات کے دس بجے اس

فدا کار اسلامی ہستی نے ہمیشہ کے لئے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ دوسرے دن چھ بجے کرکٹ فیلڈ کے میدان میں نماز جنازہ ادا ہوئی۔ اور مسجد مدرسۃ العلوم کے شمالی پہلو میں قوم کے اس رہبر حقیقی کو سپرد خاک کیا گیا۔ سر سید کی موت پر بہت سی تاریخیں لکھی گئیں۔ مگر عربی کی یہ تاریخ "غفرلہ" اپنی نوعیت کے لحاظ سے فرد ہے +

مولینا الطاف حسین حالؔی مرحوم

حالؔی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ وہ انصاریوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ننہیال سادات کا ایک شریف اور اچھا گھرانہ تھا۔ ان کے جدِ امجد کا سلسلہ خواجہ ملک علی تک پہنچتا ہے۔ جو اپنے وقت کے ایک شہرہ آفاق عالم تھے۔ اور عالم بھی باعمل عالم تھے۔ غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت میں ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ ان کے والد خواجہ ایزد بخش تھے۔ جنہوں نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ عسرت اور تنگدستی میں بسر کیا تھا۔ جب ان کا انتقال ہُوا۔ اس وقت مولینا حالؔی کی عمر نو سال تھی۔ ان کے برادر اکبر اور ہمشیرہ نے ان کی تعلیم و تدریس کا تمام تر بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا۔

سترہ سال کی عمر میں مولینا کی شادی کر دی گئی۔ جو ان کی مرضی کے خلاف تھی۔ مگر چونکہ مولینا کے سسرال خوشحال اور فارغ البال تھے۔ اسلئے انہوں نے تحصیل علم کے شوق میں نہایت خاموشی سے گھر بار کو چھوڑ دیا اور ۱۸۵۴ء میں دہلی آ گئے۔ یہاں مولینا نوازش علی سے سال ڈیڑھ سال تک عربی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ مولینا مذکور اپنے وقت کے مشہور معلم اور مسلم الثبوت واعظ تھے۔ اس وقت تک مولینا حالؔی صرف و نحو۔

عروض اور منطق وغیرہ میں کافی دستگاہ حاصل کر چکے تھے۔

۱۸۵۵ء میں اعزا و اقربا کے پُرزور اصرار پر وہ پانی پت آگئے۔ اور بطور خود مطالعہ کا مشغلہ جاری رکھا۔ ۱۸۵۶ء میں کلکٹری حصار میں ایک ملازمت اختیار کر لی۔ مگر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ غدر کی وجہ سے پھر وطن مالوف میں واپس چلے آئے۔ چار برس کے بعد نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد سے شرف ملاقات ہو گیا۔ اور مولٰینا حالی ان کے مصاحب اور ان کے بچوں کے اتالیق کی حیثیت سے ان کے پاس رہنے لگے۔ نواب شیفتہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اس لئے مولٰینا بھی اپنی غزلیں اصلاح کی غرض سے مرزا صاحب کو بھیجنے لگے۔ آٹھ برس کے بعد مولٰینا لاہور میں آگئے۔ تاکہ اپنی قسمت کی آزمائش کریں۔ یہاں گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک جگہ مل گئی۔ اور سر رشتہ تعلیم کے لئے انگریزی سے اُردو میں ترجمہ شدہ کتابوں کی درستی کا کام کرنے لگے۔ وہ انگریزی خیالات کی سادگی اور ان کی واقعیت سے بہت حد تک متاثر ہوئے اس زمانہ کی مشرقی شاعری کی خیال آفرینیوں سے نفرت کرنے لگے انہوں نے اپنے آپ کو زلف و رُخ کی قید سے آزاد کر لیا۔ اردو شاعری کی اصلاح کرنے کی غرض سے متعدد نظمیں لکھیں۔ چار سال تک لاہور مقیم رہنے کے بعد دہلی واپس آگئے۔ یہاں اینگلو عربک سکول میں ان کو مدرس کی حیثیت سے ایک جگہ مل گئی۔ یہاں سرسید مرحوم سے بھی ان کی ملاقات ہو گئی ۱۸۷۹ء میں انہوں نے اپنی مشہور اور شہرہ آفاق نظم "مسدس حالی" لکھی۔ جس نے

اسلامیانِ ہند کے مردہ جسم میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ۱۸۸۰ء میں سر سیّد مرحوم نے سر آسمان جاہ حیدر آباد سے ان کا تعارف کرایا۔ اور انہوں نے قدر دانی کرتے ہوئے مولینا کے لئے پچہتر روپیہ ماہوار کا ایک ادبی وظیفہ مقرر کر دیا۔ ۱۳۰۹ھ میں جب وہ سر سید مرحوم کی ہمراہی میں علیگڈھ کالج کے سلسلہ میں ایک ڈیپوٹیشن کے ساتھ پھر وہاں گئے۔ تو سرکار نظام نے یہ وظیفہ پچہتر کی بجائے یکصد روپیہ ماہوار کر دیا۔ اب انہوں نے ملازمت چھوڑ دی اور اپنے وطن مالوف پانی پت میں آکر تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری کر دیا۔ ۱۹۰۴ء میں حکومتِ وقت نے ان کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے شمس العلماء کا خطاب دیا۔ ۱۹۱۴ء مطابق ۱۳۳۳ھ میں ستر برس کی عمر میں آپ نے وفات پائی ؛

وہ اُردو کی نیچرل شاعری کے اولین موجد اور حامی تھے۔ ان کی نثر بھی نظم کی طرح سادگی میں رنگی ہوئی ہے۔ مگر حقیقت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ مسدس حالی اور ان کے دیوان کا خود نوشتہ مقدمہ نثر میں ان کی مشہور کتب میں سے ہیں۔ وہ صرف ناظم ہی نہیں تھے۔ اپنے وقت کے بہترین سوانح نگار بھی تھے۔ سر سید کی سوانحعمری "حیات جاوید"۔ مرزا غالب کی سوانحعمری "یادگار غالب" اور "حیات سعدی" فن سوانح نگاری کی بہترین مثالیں ہیں ؛

وہ پہلے شخص تھے۔ جنہوں نے اسلام کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو ساحل عافیت پر لگایا۔ اور وہ ان قابل قدر لوگوں میں سے تھے۔ جنہوں نے پُرانی وضع کے

مدارس میں تعلیم حاصل کر کے ایسے نمایاں کارنامے دکھائے۔ جن کی مثال اب بھی تعلیم جدید پیدا نہیں کر سکی۔ ان کی آخری فارسی نظم وہ ترکیب بند ہے۔ جو انہوں نے سرسید کی زندگی پر ۱۸۹۸ء میں لکھا۔ اور سب سے آخری اُردو نظم وہ ہے۔ جو انہوں نے ملکہ وکٹوریہ آنجہانی کی وفات پر لکھی۔ اور علیگڈھ گزٹ میں شایع ہوئی ؞

اکبر الہ آبادی

سید اکبر حسین الہ آبادی ۱۸۴۶ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ اور مدارس کی ابتدائی تعلیم کے بعد کالج کی تعلیم سے بہرہ یاب ہوئے۔ اور اس کے بعد الہ آباد میں ججی کے اعلےٰ عہدہ پر فائز ہو کر مدتوں اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ حکومت کی طرف سے ان کو "خان بہادر" کا خطاب ملا۔ شعر گوئی کا ذوق ابتدا سے ہی تھا۔ اور طبیعت میں ہلکی ہلکی ظرافت موجود تھی۔ ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی حسن ادا اور جدّت بیان ہے۔ اور ظرافت کے رنگ میں اخلاقی اور فلسفیانہ نکات و رموز کو کامیابی کے ساتھ بیان کرنا آپ ہی کا حصّہ ہے۔ اس رنگ میں ان کے کلام کو پوری شہرت اور شایانِ شان مقبولیت حاصل ہوئی۔ اکبر مرحوم اپنے اس رنگ اور طرز کلام کے اولین موجد تھے۔ جنہوں نے ملّی و وطنی جذبات کو نہایت خوبی سے انجام دیا +

وہ فطرتاً شاعر تھے۔ اور مبدا فیض نے یہ جذبہ انہیں بڑی فراخدلی سے عطا کیا تھا۔ اور خلعت قبولیت بھی وہ عنایت کی۔ جو ان کے لئے زیبا تھی۔ اکبر کے نام سے جو بھی شعر نکل جاتا تھا۔ سننے والے اپنے جذباتِ عقیدت کے باعث اس میں انہی کی روح پاتے تھے۔ ان کا لسان العصر ہونا اس بات کی دلیل نہیں۔ کہ ان کی آواز زمانہ کی ہمنوا تھی۔ بلکہ انہوں نے قوم کے اصل

روگ کو پہچان لیا تھا۔ اور ان کی طبیعت محض شاعری کی مسحور نہیں تھی۔ بلکہ مذہب ان کے تمام جذبات پر غالب تھا۔ وہ گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ کہ مسلمان مسلمان نہ رہے۔ انہوں نے معلوم کر لیا تھا۔ کہ قوم اصلاح کی ضرورت کو محسوس کر رہی ہے۔ مگر اس کو علم نہیں۔ کہ زندگی کے کن شعبوں میں کیسی اصلاح کی ضرورت ہے۔ وہ حکومت تہذیب کی غائبانہ اور کورانہ تقلید پر تلی ہوئی تھی۔ اور اپنی روایات و خصوصیات کو فنا کر دینے پر آمادہ تھی۔ چاروں طرف ایک انتشار پیدا تھا۔ اور اس کو ایک ایسے راہنما اور محتسب کی ضرورت تھی۔ جو ذاتیات اور بدعہدی کے عیوب سے پاک ہو۔ انہوں نے ایسے طریقہ سے سانپ کو مارا کہ لاٹھی بھی نہ ٹوٹی۔ اور ایسے پیرایہ میں اعتراض کیا۔ کہ قوم نے غلطی کا احساس کرتے ہوئے راست روی کی فکر کی۔ اور برا بھی معلوم نہ کیا۔

خواتین اسلام کو پردہ دری سے بچانا ان کی زندگی کا مقصد اولین تھا۔ اعتراض و احتساب میں بھی انہوں نے حسن ادا کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ خشک نصیحت سمع خراشی کا موجب ہوتی ہے۔ مگر ان کا ہر شعر "فردوس گوش" تھا۔ انہوں نے جن اصلاحات کو اپنا نصب العین بنایا۔ ان کا موضوع مذہب تھا۔ کیونکہ زندگی کی تمام جزئیات اسی کی تابع ہیں۔ لیکن اگر کسی قدر تفصیل سے کام لیا جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے جن اقطاع کی "چمن بندی" کی۔ وہ یہ ہیں:۔

(۱) معاشرت۔ جس میں پردہ پر خاص زور دیا گیا تھا۔ (۲) اتحاد۔

(۳) مذہب۔ (۴) سیاست (۵) تعلیم ؎

عام طور پر کہا جاتا ہے۔ کہ وہ "قدامت پرست" تھے اور ان کو عہدِ حاضر کی کوئی چیز بھلی معلوم نہ ہوتی تھی۔ لیکن ان کی ہمہ گیر نگاہ نے قدیم و جدید روشنیوں کے محاسن و مقابیح معلوم کر کے یہ نتیجہ نکالا تھا۔ کہ مقدم کو مؤخر پر فضیلت حاصل ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

ہے طریقِ جدید خشک مزاج　　میرے حق میں قدیم چال اچھی
گو کہ اس میں ذرا ثقالت ہے　　پھر بھی بسکٹ سے شیرمال اچھی

اس سے ان کی یہ مراد تھی۔ کہ زمانہ کے ساتھ نہ چلو۔ وہ کہتے ہیں ؎

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو　　جائز ہے غباروں پہ اڑو چرخ پہ جھولو
پر ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد　　اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

ان کی قدامت پسندی ضد یا تنگ نظری پر مبنی نہیں تھی۔ انہوں نے عقل۔ انصاف اور تجربہ سے استفادہ کیا۔ اور انہوں نے نئی روشنی اور نئی تہذیب سے دل برداشتہ ہونے کے ثبوت پیش کئے۔ نئی اور پرانی تہذیب میں زمین و آسمان کا فرق دکھایا۔ پہلے لوگ شرافت و دینداری کی قدر کرتے تھے۔ اب دولت پر مرتے ہیں ؎

تذکرۂ صاحب نسب نامے وہ وقت آیا ہے اب　　بے اثر ہو گی شرافت مال دیکھا جائیگا

؎

نہیں کچھ اس کی پرسش الفت اللہ کتنی ہے　　یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے

؎ سربلندی میری سجدہ سے ہوئی　　وہ ہنسے مٹی لگی ہے ناک میں

دلی خلوص فی زمانہ مفقود ہے۔ظاہر پرستی اور نام و نمود کی خواہش زوروں پر ہے ؎

بتائیں تم کو کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا　　پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

؎

تعجب کا محل کیا ربط آپس میں اگر کم ہے　　وہاں آنکھوں میں دنیا ہے یہاں سینہ میں عالم ہے

ذرا خانہ داری کے تعلقات پر نظر ڈالئے ؎

ان سے بیوی نے فقط اسکول کی ہی بات کی

یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

بی بی میں جو طرز مغربی ہو تو کہو　　احسان ہے یہ جو مجھ کو شوہر سمجھو

وعدہ فراموشی۔ بے وفائی اور فریب کاری آجکل پالیسی میں داخل ہے

اور حق پسندی فیشن کے خلاف سمجھی جاتی ہے۔ کہتے ہیں ؎

انکار نہیں نماز و روزہ سے مجھے　　لیکن یہ طریق اب ہے فیشن کے خلاف

تعلیم کا شور ایسا تہذیب کا غل ایسا　　برکت جو نہیں ہوتی نیت کی خرابی ہے

نئی تہذیب شرم و ایمان کے حق میں زہر ہلاہل ہے۔ کہتے ہیں ؎

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی

اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

تہذیب مغربی میں ہے بوسہ تلک معاف　　اس سے اگر بڑھو تو شرارت کی بات ہے

بانیٔ کالج بنو۔ بی۔ اے کے والد بھی بنو

یہ مگر مشکل ہے ساتھ اسکے کہ خالد بھی بنو

انہوں نے خواتین کے پردہ پر بہت زور دیا ہے۔ اگر انہیں سفلہ خو

زمانہ پر اعتبار ہوتا۔ تو وہ عورت کے لئے چار دیواری کی قید نہ لگاتے ؎

فرض عورت پر نہیں ہے چار دیواری کی قید
ہو اگر ضبط نظر کی اور خودداری کی قید

انہوں نے خواتین کی پردہ داری پر بہت کچھ لکھا ہے۔ اور عبرت دلائی ہے۔ کہ مغربی تہذیب کے بھڑے میں آکر اپنی تہذیب قدیمہ کا ستیاناس نہ کرو۔ اور مذہب کو دنیا پر ترجیح دی ہے۔ غرضکہ انہوں نے جس رنگ میں لکھا خوب لکھا۔ اور برجستہ لکھا۔ اور نہ صرف وقت پر لکھا۔ بلکہ وقت آنے سے بہت پہلے دنیا کو بتلا دیا۔ کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے ۔

افسوس! انہوں نے کچھ عرصہ صاحب فراش رہنے کے بعد ۱۹۲۱ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کے کلام کا مجموعہ تین دیوانوں میں چھپ کر شایع ہو چکا ہے۔ اور غالباً آخری حصہ ابھی شایع ہونا باقی ہے جو زیر ترتیب ہے ۔

مرحوم نظم طباطبائی

وہ ۱۲۷۰ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اصل نام علی حیدر تھا۔ اور نظم تخلص کرتے تھے۔ انہوں نے ابتدائی فارسی تعلیم منشی منیڈولال زار سے حاصل کی۔ ملا طاہر صرفی سے عربی صرف و نحو پڑھی۔ اور خاتمۃ الدین سے درس نظامی کی کتب پڑھیں۔ ۱۳۰۰ھ میں انہوں نے تشریح افلاک پر ایک حاشیہ لکھا۔ جو مسٹر کرافٹ وزیر تعلیمات کے نام سے معنون کیا اور کلکتہ کے مطبع اردو گائیڈ اخبار سے شایع ہوا۔

وہ اسی زمانہ میں مدرسہ شاہ اودھ میں شاہزادوں کی تعلیم پر متعین ہو گئے اور ان کے لئے تعریب الاطفال تصنیف کی۔ جس کو دیکھ کر لوگوں نے صدہا کتابیں اسی رنگ میں شایع کرنا شروع کر دیں۔ وہیں کلکتہ میں ان سے دربارِ واجد علیشاہ کے مشہور شعرا ر۔ سبعہ سیارہ۔ نقل صولت۔ بیدار اور درخشاں کی ملاقات ہوئی۔ اور وہیں مولینا عبدالحلیم شرر مرحوم نے آپ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔

کلکتہ سے وہ حیدرآباد آگئے۔ اور نظام کالج میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔ یہاں انہوں نے مبنیات و معربات اسی طرز کی دو کتابیں اور لکھیں۔ جن کو لوگوں نے ان کی کرامت سمجھا۔ کچھ دنوں دارالترجمہ سے بھی ان کا تعلق رہا۔ اور اس دوران میں نواب حیدر یار جنگ بہادر کا خطاب بھی ملا۔ وہ

مدراس یونیورسٹی کے بورڈ آف سٹڈیز کے رکن بھی تھے۔ اور انہی کی تحریک سے دیوان مرزا نوشہ بی۔ اے کے نصاب میں شامل ہوا۔ جس کی بنا پر انہیں سارے دیوان کی شرح لکھنا پڑی۔ اس پر سید آقا علی شوستری نے کہا۔ کہ اردو کے دیوان کی شرح لکھنا سبکی کا باعث ہے۔ کسی عربی دیوان کی شرح لکھو۔ چنانچہ انہوں نے دیوان امراء القیس کی اُردو شرح لکھی۔ اور یہ دونوں شرحیں اردو زبان کی ترقی کا موجب ہوئیں +

حیدر آباد کے مدرسہ "دار العلوم" میں جو طلبہ عربی اور فارسی پڑھا کرتے تھے۔ وہ فاضل و عالم کے امتحانات ہمیشہ پنجاب یونیورسٹی میں دیا کرتے تھے۔ (اور پنجاب سے امتحانی سوالات مدرسہ مذکور میں آجایا کرتے تھے)۔ لارڈ کرزن وائسرائے ہند کے دور حکومت میں ایک کمیشن کا تقرر عمل میں آیا۔ جس نے ہندوستان میں تعلیمات کے لئے دَورہ کیا۔ اور اس نے حیدر آباد کو پنجاب یونیورسٹی سے علیحدہ کر دیا۔ ان ایام میں فارسی و عربی کے امتحانات کا زمانہ بہت قریب تھا۔ اور طلبہ اس امر کا استحقاق حاصل کر چکے تھے۔ کہ اپنی سالانہ محنت کو ٹھکانے لگائیں۔ علامہ نظم ان دنوں نظام کالج کے پروفیسر تھے اور دار العلوم کے اعلے درجوں کا امتحان لینا انہی کے ذمہ تھا۔ وہ امتحان لے چکے تھے۔ اور پنجاب یونیورسٹی کے لئے فاضل و عالم کے امتحانات میں شریک ہونے والے طلبہ کا انتخاب بھی عمل میں آچکا تھا۔ انہیں طلبہ کی مایوسی پر افسوس ہوا۔ اور انہوں نے ڈاکٹر رگھوناتھ سے تذکرہ کیا۔ کہ ہم ان طلبہ کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے بہتر لے سکتے ہیں۔ اور سندات بھی دے سکتے ہیں۔

چنانچہ ڈاکٹر رگھوناتھ۔ڈاکٹر نیشی کانتا نے اس پر آمادگی کا اظہار کیا۔اور وہاں کے مشاہیر علماء کا ایک بورڈ مقرر کر کے امتحان کا اشتہار دے دیا۔سوالات مرتب کر کے بورڈ کی نگرانی میں شایع کئے۔اور یہ امتحان پنجاب یونیورسٹی سے زیادہ شان کے ساتھ ہوا۔یہ ان ہی کی محنت شاقہ کا نتیجہ تھا جس پر آج تک عمل ہو رہا ہے ؟

مدراس یونیورسٹی میں فارسی وعربی کے امتحانات اور "دبیر" و "افضل العلماء" کے خطابات انہی کی مساعی حسنہ سے جاری ہوئے۔لیکن سالہا سال کے بعد ان کو مدراس یونیورسٹی کے رجسٹرار کا ایک مکتوب موصول ہوا۔کہ آپ سینٹ ہاؤس کی مجلس شوریٰ میں آ کر اس امر کا فیصلہ کریں۔کہ چھ برس سے فارسی وعربی کے امتحانات کا نصاب دبیر و افضل العلماء کے طلبہ کے لئے یونیورسٹی کے کیلنڈر میں شایع ہو رہا ہے مگر آج تک شرکت امتحان کے لئے کسی نے درخواست نہیں دی ؟

حقیقت یہ تھی۔کہ مدراس یونیورسٹی نے طلبہ کے لئے یہ شرط لگا دی تھی۔کہ ان کا انٹرنس میں پاس ہونا ضروری ہے۔ان دنوں یونیورسٹی کی مجلس نصاب کے صدر سر عبدالرحیم تھے۔وہ مجلس شوریٰ سے دو یوم قبل ان کی کوٹھی پر ملے۔انہوں نے کہا کہ جب فارسی وعربی کے امتحان میں کوئی شریک ہی نہیں ہوتا۔تو ان امتحانات کو موقوف کر دینے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔انہوں نے جواب میں کہا۔کہ انٹرنس کی شرط انہیں امتحان میں آنے کو مانع ہے۔جبکہ پنجاب یونیورسٹی میں یہ شرط نہیں ہے۔ وہ

مولوی بذل اللہ خاں مدراس کارپوریشن کے صدر اور رکن مجلس نصاب سے بھی ملے۔ نواب عبدالرحمٰن خاں شاطرؔ سے بھی اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ اور جب سینٹ ہاؤس میں مجلس نصاب کے ارکان کا اجتماع ہوا۔ تو انٹرنس کی شرط نہایت آسانی سے اُڑ گئی۔ اس پر طلبہ نے ان کی دلی کوششوں کی داد دی ۔

نواب فصاحت جنگ جلیل نے اعلیحضرت غفران مکان کے جشن جوبلی کی تاریخ دو جلدوں میں لکھی۔ جس کو پیشگاہ خسروی کے مجریہ فرمان کے مطابق آپ نے بنظرِ اصلاح دیکھا۔ اس کو اوّل سے آخر تک پڑھا۔ اور اس میں ضروری مضامین کا اضافہ بھی کیا۔ تلخیص عروض و قافیہ ایک کتاب لکھ کر ان گتھیوں کو سلجھا دیا۔ جو فارسی و اُردو داں حضرات کو الجھن میں ڈالے ہوئے تھیں۔ اور ساتھ ہی حشو و زوائد کو بھی چھانٹ کر رکھ دیا ۔

سنہ ۱۳۳۵ھ میں شاہزادگانِ والاجاہ کی تعلیم ادب پر ان کا تقرر ہوا۔ اور وہ چار سال تک اس فرض کو ادا کرتے رہے۔ سنہ ۱۳۳۶ھ میں دارالترجمہ کی اصلاحِ زبان و طرزِ بیان کا کام ان کے سپرد ہوا۔ اور تین سال کے بعد ان کا وظیفہ ہوگیا۔ لیکن چند ماہ بعد پھر دارالترجمہ میں ان کو مقرر کیا گیا۔ چھ سال تک انھوں نے اصلاح ترجمہ کا کام کیا۔ تاریخ طبری کی ایک جلد کا ترجمہ بھی کیا۔ اس کے صلہ میں ان کو علاوہ تنخواہ کے انعام بھی ملا ۔

وہ تہذیب کا بہترین نمونہ تھے۔ حد درجہ کے مخلص اور ہمدرد تھے۔ ان کے طرز عمل میں کبھی اور کسی حال میں فرق نہ آیا۔ گھنٹوں علمی و ادبی گفتگو

اور مشرقی تہذیب و شائستگی پر حرف و حکایات کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ اور پورے مہمان نواز تھے۔ اُردو شاعری میں ان کی شخصیت بہت بلند تھی۔ سنہ ۱۹۰۲ء سے سنہ ۱۹۳۳ء تک ہزاروں شاگردوں نے ان سے اپنے کلام میں اصلاح لی۔ حیدرآباد میں ان کا آخری مجموعہ کلام "کلیات نظم" کے نام سے چھپ رہا ہے۔ یا چھپ چکا ہے۔ وہ اُردو فارسی کے جیّد عالم تھے اور انگریزی زبان سے بھی کسی قدر واقف تھے۔ سنہ ۱۳۵۲ھ میں بیاسی سال کی عمر میں آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

مولینا شبلی نعمانی مرحوم

مولینا شبلیؒ بغاوت ہند کے سال ۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڑھ (صوبہ متحدہ) کے ایک گاؤں بندول میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک معزز اور ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد اعظم گڑھ میں وکیل تھے۔ خاندان میں علم کا چرچا تھا۔ انہوں نے ابتدا میں فارسی تعلیم حاصل کی پھر عربی۔ اعظم گڑھ سے رام پور اور وہاں سے لاہور آئے۔ اور ہندوستان میں جہاں جہاں کسی مشہور علمی درسگاہ کا پتہ ملا۔ اس میں جاکر عربی و فارسی تعلیم حاصل کی۔ لاہور میں مولینا فیض الحسن اور نیٹل کالج سے استفادہ کیا۔ وہ خود اپنے ایک خط محررہ ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء میں لکھتے ہیں۔ کہ "اس زمانہ میں تعلیم کا حاصل کرنا بہت مشکل تھا۔ طلبہ یکہ پر سفر کرتے تھے۔ پیدل بھی جانا پڑتا تھا۔ میں نے یہ تمام مصائب خوشی سے قبول کیں اور دو بار والد کی اجازت کے بغیر چپکے چپکے گھر سے نکل گیا۔ میں نے صرف انہی علمار کے پاس جاکر زانوئے تلمذ تہ کیا۔ جو علم ادب۔ منطق۔ حدیث اور اصول فقہ میں تمام ہندوستان میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ مثلاً حدیث کے لئے مولانا احمد علی سہارنپوری۔ ادب کے لئے مولانا فیض الحسن لاہوری۔ والد صاحب کا تقاضا تھا۔ کہ میں علمی مشاغل کو چھوڑ کر وکالت کروں۔ چنانچہ مجبور ہو کر امتحان دیا۔ اور

کامیاب ہوکر چند روز وکالت کی۔ اور پھر علمی مشاغل میں مصروف ہوگیا۔ اور علیگڈھ کی پروفیسری للعہ روپیہ ماہوار پر قبول کرلی" ٭

آپ ۱۸۷۶ء میں ۱۹ سال کی عمر میں حج کو روانہ ہوئے۔ اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے مقدس مقامات کی زیارت کی۔ مدینہ منورہ کے کتب خانوں میں حدیث کی بعض ایسی نایاب کتابیں دیکھیں۔ جو بعد میں کہیں نظر سے نہ گزریں ٭

مکہ معظمہ سے واپس آکر علم وشاعری کا مشغلہ اختیار کیا۔ اعظم گڑھ کے ایک کتب فروش کی دوکان سے اردو اور فارسی کے دیوان دیکھا کرتے تھے مشاعروں میں حصہ لیتے اور اس زمانہ کے مشہور رسالوں "پیام یار"۔ اور "اودھ پنچ" کے پرچے شوق سے پڑھا کرتے تھے ٭

وہ غیر مقلدوں کی تردید اور مخالفت کیا کرتے تھے۔ ان کا قول تھا۔ کہ "انسان عیسائی ہوسکتا ہے۔ مگر غیر مقلد نہیں ہوسکتا"۔ ان کا عربی رسالہ "اسکات المعتدی" اسی مذہبی جوش اور تعصب کی یادگار ہے۔ اس زمانہ کے مسلمانوں کی جنگ حنفیت اور وہابیت میں شدومد سے حصہ لیتے تھے۔ مولٰینا شرر لکھتے ہیں۔ کہ:۔

"شبلی نے جن درسگاہوں میں تعلیم پائی۔ اور جن اساتذہ سے پڑھا ان کی صحبت نے انہیں سخت حنفی بنا دیا تھا۔ اس شوق میں انہوں نے اپنے نام کے ساتھ نعمانی لکھنا شروع کردیا۔ جس کی وجہ سے ناواقف لوگوں نے انہیں نسباً نعمانی یعنے امام اعظم ابوحنیفہ کوفی کی نسل خیال کرلیا۔ جو بالکل

بے اصل اور بے حقیقت ہے ۔ وہ سخت حنفی تھے ۔ اور اس میں اپنے آپ کو ممتاز ثابت کرنا چاہتے تھے "۔

وہ مذہبی لحاظ سے سخت جابر واقع ہوئے تھے ۔ چنانچہ انہوں نے بعض لڑکوں کو اس لئے دو دو گھنٹہ تک پیٹا ۔ کہ وہ آئندہ نماز پڑھنے کا وعدہ کریں ۔ لیکن گھر والے ان سے مطمئن نہ تھے ۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ دنیاوی حیثیت سے کامیاب ہوں ۔ چنانچہ انہوں نے پہلے وکالت پھر امانت کا کام نبھانا چاہا ۔ مگر ایک شاعر مزاج اس قسم کے کام کس طرح انجام دے سکتا ہے ۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مطالعہ و تدریس میں مصروف ہو گئے ۔ اور تالیف و تصنیف کا سلسلہ شروع کر دیا ۔

۱۸۸۲ء میں وہ علیگڈھ کالج کے پروفیسر مقرر ہو گئے ۔ ان کا بیان ہے ۔ کہ " میں سر سید مرحوم کا کتب خانہ دیکھ کر باغ باغ ہو گیا ۔ مصر و یورپ کی تمام جدید و قدیم مطبوعات الماریوں میں سجی ہوئی تھیں ۔ پہروں الماریوں کے پاس کھڑا رہتا ۔ اور کبھی کبھی تھک کر وہیں زمین پر بیٹھ جاتا "۔

اس زمانہ میں دائرہ علمیہ میں مولینا حالی اور مسٹر آرنلڈ بھی شریک تھے ۔ سر سید کے بعد مسٹر آرنلڈ کے علمی خیالات سے وہ بہت متاثر ہوئے ۔ انہوں نے مسٹر آرنلڈ کو " دعوت اسلام " کی تصنیف و ترتیب میں بہت مدد دی ۔ اور مسٹر آرنلڈ نے ان کو مغربی علوم اور ان کی تفتیش سے آگاہ کیا ۔ آرنلڈ نے شبلی سے عربی سیکھی اور شبلی نے آرنلڈ سے فرانسیسی زبان کا درس لیا ۔

۱۸۸۲ء سے ۱۸۹۸ء تک سولہ سال انہوں نے علیگڈھ کالج میں

گذارے۔ اس دوران میں انہوں نے متعدد کتابیں لکھیں اور شایع کیں۔ جنہوں نے قومی فضا میں ترقی کی لہر پیدا کر دی۔

۱۸۸۴ء میں انہوں نے "مثنوی صبح اُمید" لکھی۔ جو ادبی خوبیوں کے علاوہ سرسید مرحوم کے خیالات کا آئینہ ہے۔ ۱۸۸۷ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دوم منعقدہ لکھنؤ میں انہوں نے "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" پر ایک فاضلانہ خطبہ پڑھا۔ یہ پہلا موقع تھا۔ جبکہ ان کی علمیت اور اسلام سے محبت کا اظہار ہوا۔

۱۸۸۹ء میں رائل ہیروز آف اسلام کے سلسلہ میں انہوں نے "المامون" لکھی۔ اور سرسید کی خدمت میں ہدیۃً پیش کی۔ یہ کتاب ان کی سیرت نگاری کی پہلی زبردست کوشش تھی۔ پھر "الجزیہ" اور "کتب خانہ اسکندریہ" مرتب کئے۔ ۱۸۹۲ء میں انہوں نے روم و مصر و شام کا سفر کیا۔ جو ان کے اسلامی اور علمی شوق کا محرک ہوا۔ ۱۸۹۳ء میں سیرت النعمان مکمل ہوئی۔ پھر سفرنامہ روم و مصر و شام شایع ہوا۔ ۱۸۹۸ء میں "رسائل شبلی" کتابی صورت میں شائع کئے۔

مارچ ۱۸۹۸ء میں سرسید نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اور مئی میں شبلی کالج سے رخصت لے کر اعظم گڑھ چلے گئے۔ اور وہیں سے اپنا استعفا بھیج دیا ۱۸۹۹ء میں وہ کشمیر چلے گئے۔ جہاں ان کی صحت بہت خراب ہو گئی۔ "الفاروق" جو انہوں نے "المامون" کے بعد لکھنا شروع کر دی تھی۔ اور جس کے لئے علمی تحقیق کا خیال مصر و روم و شام کے سفر میں اُن کو برابر رہا وہ کشمیر میں تکمیل کو پہنچی۔ جب انہوں نے اس گراں بہا تصنیف کی آخری سطریں

لکھی ہیں۔ اس وقت وہ بستر علالت پر دراز تھے۔ اور گھنٹوں بے ہوشی کی حالت طاری رہتی تھی ۔

اسی سال وہ ریاست حیدر آباد میں ناظم شعبہ علوم و فنون مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں "الغزالی" اور اس کے بعد "علم الکلام" طبع ہوئی۔ ۱۹۰۴ء میں "علم الکلام" ۔ پھر موازنہ انیس و دبیر اور سوانح مولانا روم طبع ہوئی ۔ اب انہوں نے حیدر آباد چھوڑ کر لکھنو کا رخ کیا۔ اور اپنے آپ کو ندوۃ العلماء سے وابستہ کر لیا۔ جس کی تحریک ۱۸۹۴ء میں شروع ہوئی تھی۔ اور جس کے متعلق ایک دار العلوم انہی کے خیال کے مطابق ۱۸۹۸ء میں قایم کیا گیا تھا ۱۹۱۳ء تک انہوں نے برابر نو سال ندوہ کی خدمت کی ۔ ۱۹۱۳ء میں لکھنو چھوڑ کر اعظم گڑھ چلے گئے۔ یہاں انہوں نے شعر العجم کا دوسرا۔ تیسرا اور چوتھا حصہ اردو میں شایع کیا۔ پہلا حصہ ۱۹۰۸ء میں چھپ چکا تھا۔ اور پانچواں ان کی موت کے چار سال بعد شایع ہوا۔ ۱۹۱۴ء میں کتاب "سیرۃ النبی" زیر تصنیف تھی۔ کہ ۱۸ ر نومبر ۱۹۱۴ء کو پیغام موت آگیا۔ مولانا محمد یحییٰ تنہا لکھتے ہیں۔ کہ "۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ اور ۵۷ برس کی عمر پائی۔ ہنگامہ مشرق (غدر) میں ظہور کیا۔ اور ہنگامہ مغرب (جنگ یورپ) میں مخفی ہوئے۔ "بدر الاسلام" سیرۃ نبوی سے پہلے لکھی۔ اور سیرۃ نبوی پر آخری دم توڑا" ۔

ان کی وفات کے بعد ۱۹۱۶ء میں "مکاتیب شبلی" کا پہلا حصہ۔ ۱۹۱۷ء میں دوسرا حصہ۔ ۱۹۱۸ء میں سیرۃ نبوی حصہ اول اور ۱۹۲۰ء میں

حصہ دوم شایع ہوئیں۔ سفر روم کے دوران میں سلطان ترکی نے "تمغہ مجیدی" عطا کیا۔ برٹش گورنمنٹ نے "شمس العلماء" کا خطاب دیا۔ اور الہ آباد یونیورسٹی کا فیلو بنایا۔ اور ۱۸ / نومبر ۱۹۱۴ء کو یہ عظیم الشان شخصیت مسلمانوں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی +

مولانا عبدالحلیم شررؔ

مولانا شررؔ غدر ۱۸۵۷ء کے تین سال بعد ۱۸۶۰ء مطابق ۱۲۷۶ھ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ کا نام حکیم تفضل حسین تھا۔ جو عربی اور فارسی کے شہرہ آفاق عالم تھے۔ اور طبابت میں اعلےٰ دستگاہ رکھتے تھے۔ مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ بعدازاں علم معقول۔ علم ادب اور علم منطق کی درسی کتابیں دوسرے اساتذہ سے پڑھیں انہوں نے طبی تعلیم بھی شروع کی تھی۔ اور کچھ انگریزی میں بھی استفادہ کیا تھا۔ مگر یہ سب کچھ پرائیویٹ تھا۔ اور بالکل ناقص تھا۔ ان کو اخبار بینی اور صحیفہ نگاری کا شوق اسی زمانہ سے پیدا ہوگیا تھا۔ وہ "اودھ اخبار" لکھنؤ میں ایک نامہ نگار کی حیثیت سے خبریں لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ ۱۹ سال کی عمر میں کلکتہ سے لکھنؤ آئے۔ اور مولانا محمد عبدالحی مرحوم سے عربی کی درسی کتابیں پڑھیں۔ بیس سال کی عمر میں وہ دہلی آگئے۔ اور مولوی نذیر حسین محدث دہلوی کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرکے علم حدیث کی تکمیل کی۔ اب مولانا کو دوبارہ انگریزی تعلیم کی تحصیل کا شوق پیدا ہوا۔ اور انتہائی محنت سے خانگی طور پر بقدر ضرورت انگریزی میں دستگاہ پیدا کرلی۔ اب انہوں نے اخبارات میں باقاعدہ مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کردیا۔ جن میں سیاسیات کے بجائے

انشا پردازی کا عنصر غالب تھا۔ اور ان کے ادیبانہ ذوق کا پتہ دے رہا تھا۔
۱۸۸۰ء میں وہ "اودھ اخبار" لکھنؤ کے صیغہ ادارت میں شریک ہو گئے۔ جوانی کی عمر تھی۔ ادبی ذوق کی بلند پروازی معراج اعلےٰ پر تھی۔ ان کی صحیفہ نگاری کے اس خاص رنگ کی شہرت پنجاب و سندھ کے کونے کونے میں پھیل گئی۔
وہ ۱۸۸۲ء میں "اودھ اخبار" سے علیحدہ ہو گئے۔ اور ناول نگاری کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کا سب سے پہلا ناول "دلچسپ" تھا۔ جس نے شایع ہوتے ہی ایک خاص مقبولیت حاصل کی۔ ۱۸۸۷ء میں انہوں نے اپنا مشہور ماہوار رسالہ "دلگداز" جاری کیا۔ جس نے ایک قلیل عرصہ میں عام قبولیت حاصل کر لی۔ ۱۸۸۸ء میں انہوں نے "دلگداز" میں مسلسل ناول لکھنا شروع کر دیئے۔ جو بعدازاں کتابی صورت میں شایع ہوئے۔ اور انکو خاص مقبولیت حاصل ہوئی۔ ۱۸۹۱ء میں وہ حیدرآباد چلے گئے۔ اور ریاست میں دوصد روپیہ ماہوار مشاہرہ پر ملازم ہو گئے۔ ۱۸۹۵ء میں نواب وقارالامرا ر کے صاحبزادہ کے اتالیق مقرر ہو کر انگلستان بھیجے گئے۔ جہاں قریبًا سال۔ سوا سال تک مقیم رہے۔ انہوں نے اس اقامت سے یہ جائز فائدہ اٹھایا کہ کسی قدر فرانسیسی زبان سیکھ لی۔

۱۹۰۰ء میں ہندوستان میں واپس آگئے۔ اور اسی سال میں حیدرآباد سے لکھنؤ چلے آئے۔ مگر ۱۹۰۱ء میں ان کو دوبارہ حیدرآباد میں بلا لیا گیا۔
آخر کار ۱۹۰۴ء میں مستقل طور پر لکھنؤ میں آکر اقامت اختیار کر لی۔ اور رسالہ "دلگداز" اور "مہذب" از سر نو جاری کیے۔ لیکن ناول اور تاریخ نگاری کا فطری وق

بدستور زندہ رکھا۔ اور ۱۹۲۶ئہ تک اسی ذوق میں منہمک رہے۔ اسی سال
میں انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔ مولانا کی ادبی
اور اسلامی خدمات ابدالآباد تک یاد رہیں گی۔ اور ہندوستان کا آئندہ اسلامی
مؤرّخ ان خدمات کو سنہری حروف میں رقم کرے گا۔ مولینا کے تمام ناول سراپا
تاریخ اسلام کے واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ تاریخی
ناول نگاری کی ابتدا انہی کی طرف سے ہوئی اور انہی پر ختم ہوگئی۔ مولینا واقعات کو
ایسے افسانہ نما رنگ میں تحریر کرتے تھے۔ کہ اس عہد کی ہوبہو تصویر قارئین
کی نگاہوں میں پھر جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ وہ تاریخی ناول نگار کی حیثیت
سے بالخصوص مشہور ہیں۔ انہوں نے تاریخ اور سوانح کی متعدد کتابیں لکھی
ہیں۔ جن میں سے چند عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے نصاب میں بھی داخل ہیں
مولینا مرحوم اُردو میں اس نئے رنگ کے موجد ہیں۔ جو آج عام طور پر اخبارات
میں دیکھی جاتی ہے۔ ان کی نثر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے۔ کہ اسکے
اندر خیال آفرینی۔ دلچسپی۔ دلکشی اور منظر کشی پائی جاتی ہے۔ جو بہت کم
ناول نگاروں کے حصہ میں آئی ہے ؛

ڈاکٹر ٹیگور

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور ۱۸۶۱ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ وہ بنگال کے ایک معزز اور دولتمند گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد دیویندر ناتھ ٹیگور برہمو سماج کے مقتدر لیڈر تھے۔ اور لوگ انہیں مہرشی کہا کرتے تھے۔ ان کی والدہ بھی ہندوستان کی ایک بہترین خاتون تھیں۔ اس لئے ڈاکٹر رابندر ناتھ نے بہت سی پاکیزہ خصائل اور روحانی برکات اپنے والدین سے حاصل کی ہیں۔ مگر وہ ماں باپ کے فیضان صحبت سے بہت کم بہرہ یاب ہوئے۔ ان کی والدہ ان کی کم سنی میں ہی انتقال کر گئیں۔ اور ان کے والد کی مذہبی مصروفیات ان کو اپنے فیضان کا بہت کم حصہ دے سکیں۔ اس لئے ٹیگور کا عہد بچپن زیادہ تر خلوت میں ہی گذرا۔ مگر وہ اس تنہائی میں بھی دنیا کی گوناگوں رعنائیوں اور رنگینیوں کے کیف پرور مناظر سے لطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔

ان کی پیدائش کے موقع پر بنگال میں مذہبی اور ادبی انقلابات رونما تھے۔ مذہبی انقلابات کے بانی راجہ رام موہن رائے تھے۔ جو مذہب کو رواداری اور انسانی مساوات کی طرف لا رہے تھے۔ اور ادبی انقلاب کے موجد بنکم چندر چیٹر جی تھے۔ جو بنگالی زبان میں اپنے ادبی کارناموں کے

ذریعہ دنیا کو محوِ حیرت کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ ملکی اور دنیوی نقطۂ نگاہ سے ایک تیسرا انقلاب بھی تھا۔ جو ہندوستان کے فنِ مصوّری سے تعلق رکھتا تھا۔ اور اپنی روحانی اور فطری سادگی کی بدولت مغربی مصوّری کی مادی اور مصنوعی رنگینیوں کو بے رونق کرنے پر آمادہ تھا۔ یہ انقلاب انگیز ماحول ٹیگور کے تخیّل کی روحانیت، طرزِ تحریر کی جدّت اور اس کی رنگینیٔ کلام میں نمایاں ہے +

ان کی ابتدائی تعلیم ایک پاٹھ شالہ میں ہوئی۔ جو اساتذہ کی سخت گیری کے باعث ان کی آزادی میں خلل انداز ہوئی۔ اور دراصل یہ تعلیم اِن کے نازک دل کے لئے گراں بار تھی۔ غرض تیرہ سال کی عمر میں انہوں نے اس تعلیم سے نجات حاصل کی۔ جو ان کو اپنی سنگین دیواروں میں محبوس کرنا چاہتی تھی۔ وہ کسی سکول یا کالج میں کبھی داخل نہیں ہوئے۔ سترہ سال کی عمر میں وہ انگلستان چلے گئے۔ اور ایک سال تک انگریزی علم و ادب میں دستگاہ حاصل کی۔ اور وہاں کے نامور ادیب و مصنف جان مارلے کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ان کا ارادہ تھا۔ کہ بیرسٹری کی سند حاصل کرلیں۔ مگر ان کا یہ ارادہ پورا نہ ہُوا +

ان کے خاندان کو موسیقی۔ مصوّری اور شاعری سے فطری دلچسپی تھی۔ جو ان کی آئندہ ترقیات کا موجب ہوئی۔ وہ شاعری کے علاوہ موسیقی اور مصوّری میں بھی دستگاہ کامل رکھتے ہیں۔ ان کے ندرت آفرین گیت اور ان کی خوش الحانی ان لوگوں کو بھی کیف و سرور کے عالم میں ڈبو دیتی ہے۔ جو ان کی مادری زبان سے قطعاً ناواقف ہیں۔ وہ بحیثیت فنِ ناچ سے

بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ کیونکہ بنگال کی معزز سوسائٹی میں مستورات کا گانا یا ناچنا معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ وہ ڈراموں میں بھی شوق سے حصہ لیتے ہیں۔

تئیس سال کی عمر میں ان کی شادی ہوگئی۔ ان کے والد نے ان کو زمینداری کے کام کی نگرانی سپرد کردی۔ اور انہیں دیہات میں جانے اور وہاں کام کرنے کا موقع مل گیا۔ رفتہ رفتہ ان کی طبیعت دیہاتی زندگی سے مانوس ہوگئی۔ اور دیہاتی باشندوں کی اصلاح ان کی زندگی کا جزو لاینفک بن گیا۔ جن کی تکمیل آج بھی ان کے نصب العین میں داخل ہے۔ ۱۸۹۰ء میں ان کے والد نے کلکتہ سے سو میل کے فاصلہ پر شانتی نکیتن ایک درسگاہ کھولی۔ جس میں کچھ لڑکے داخل ہوگئے۔ اور رفتہ رفتہ ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ آخر کار ٹیگور نے اس کو سکول کی شکل میں منتقل کردیا۔ اور اس کو مدارجِ ترقی پر پہنچانے کے لئے انہوں نے اپنی کتابوں کا حق تصنیف و تالیف فروخت کرنے کے علاوہ اپنی بیوی کا زیور بھی فروخت کردیا۔ اور طلبہ کو خود تعلیم دینا شروع کی۔ ۱۹۲۱ء میں یہ سکول بشو بھارتی نام کا دار العلوم بن گیا جہاں اب ادبی تعلیم کے علاوہ مصوری۔ موسیقی۔ صنعت و حرفت اور زراعت کے مختلف شعبے ہیں۔ ان میں دیہاتوں کی تنظیم حفظانِ صحت اور صفائی کا ایک شعبہ بھی ہے۔ دیہاتوں میں زراعتی نمائشیں کی جاتی ہیں اور طلبہ کو جلد سازی۔ لکڑی۔ چمڑا۔ اور بُننے کا کام سکھایا جاتا ہے۔ اس دار العلوم میں ایک شاندار کتب خانہ ہے۔ جس میں ہر زبان کی بہترین کتابیں موجود ہیں۔ ایک چھاپہ خانہ بھی ہے۔ اس سکول میں امریکہ۔ انگلستان۔ جرمنی اور

اٹلی کے معلم اور متعلم دونوں پائے جاتے ہیں۔ رنگ۔ نسل اور مذہب کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ گویا وہ محبت کی ہمہ گیریت کے حامی ہیں۔ اور بشو بھارتی کے ذریعہ دنیا کو اپنا پیغام محبت دے رہے ہیں۔ انہوں نے دنیا کے خاص خاص ممالک کی سیاحت کی جس سے انگلستان۔ فرانس۔ جرمنی۔ اٹلی۔ امریکہ۔ چین۔ جاپان اور مالابار کے باشندے ان کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوئے یہ سیر و سیاحت نہ صرف ان کی معلومات میں اضافہ کرنے کا باعث ہوئی بلکہ ان کو انسانی فطرت کی گوناگوں دلچسپیوں اور مناظر فطرت کی بوقلموں رعنائیوں سے بہرہ اندوز ہونے کا موقعہ ملا۔ انہوں نے اپنا پیغام روحانیت ساری دنیا کو پہنچا دیا۔ ان کی بعض تقریریں "سادھنا" نام کتاب میں شایع ہو چکی ہیں۔

وہ ابتدا سے ہی مناظر فطرت کے شیدائی تھے۔ نیلگوں آسمان۔ زرپاش آفتاب۔ سیاہ و سفید بادل۔ مہتاب کی سیمیں روشنی۔ ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کی ضیا افروزیاں اور برق و باراں کے دلکش نظارے۔ ان کی طفلانہ توجہ کو اپنی طرف جذب کیا کرتے تھے۔ اور یہی مناظر ان پر بے خودی کا عالم طاری کرنے والے ثابت ہوئے۔ انہی مناظر نے ان کے دل کو محبت اور روحانیت کے جذبات سے متحرک کیا۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں انہوں نے نظمیں لکھنا شروع کر دیں جن سے عالمگیر محبت ٹپکتی تھی۔ اور یہ ان کی روحانیت کی اولین منزل تھی۔ ۳۵ سال کی عمر میں ان کی اہلیہ، ان کی لڑکی اور ان کا لڑکا فوت ہو گئے۔ ان صدمات عظیم نے ان کو یک دم روحانیت کی جانب مائل کر دیا اور ان کے کلام میں وہی جذبہ کارفرما ہو گیا۔ جس کا جزو ی رنگ ان کی گیتانجلی میں

نمایاں ہے۔ جو ۱۹۱۲ء میں انہوں نے ولایت میں تیار کی۔ یہ کتاب ان کی بعض بنگالی نظموں کا انگریزی ترجمہ ہے۔ جس کی بدولت ۱۹۱۳ء میں ان کو سوالاکھ روپیہ کا نوبل انعام ملا۔ جو انہوں نے اپنی شاعرانہ بے نیازی سے شانتی نکتین کے حوالے کر دیا۔ اس انعام کی وجہ سے ان کی شہرت کا آفتاب ساری دنیا میں چمک گیا ۔

گیتانجلی کے علاوہ انہوں نے متعدد کتابیں لکھیں ۔ جو شایع ہو چکی ہیں اور اس پیرانہ سالی میں بھی برابر لکھتے جا رہے ہیں ۔ علم ادب کے علاوہ ناٹک ناول، افسانے ۔ گیت اور دیگر متفرق مضامین پر ان کی کتابیں کافی تعداد میں ملتی ہیں ۔ وہ کئی ماہوار رسالوں کے کامیاب مدیر بھی رہ چکے ہیں ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے جرمنی کی ایک مشنری خاتون سے جرمن زبان بھی سیکھی ۔ تاکہ وہ جرمنی کے زندۂ جاوید شاعر گیٹے کی مشہور و معروف تصنیف "فاسٹ" کا اسی کی زبان میں مطالعہ کریں ۔ ایک موقعہ پر انہوں نے ایک ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا :۔ "کچھ لوگ مجھے فلاسفر سمجھتے ہیں اور کچھ لیڈر ۔ کچھ لوگ مجھے تعلیمی مشنری خیال کرتے ہیں اور کچھ ماہر سیاسیات مگر میں کچھ بھی نہیں ہوں ۔ صرف ایک بانس کی بنسری ہوں ۔ جس سے کبھی کبھی میرا خدا اپنا ترانہ سنا دیا کرتا ہے" ۔

ان کو سیاسیات سے کوئی عملی دلچسپی نہیں ۔ مگر وہ آزادی کو نعمت غیر مترقبہ سمجھتے ہیں ۔ جس کا تعلق روح انسانی سے ہے ۔ اور جو ایثار کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے ۔ تاہم وطنی محبت ان کے شاعرانہ دل میں کوٹ کوٹ کر

بھری ہوئی ہے - اور ملک کے اہم واقعات و حادثات سے اکثر متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ اور اسی بنا پر انہوں نے گورنمنٹ کو سر کا خطاب واپس کر دیا تھا ایک موقعہ پر انہوں نے کہا تھا۔ کہ "آزادی جھنڈا اُڑانے اور سُوت کاتنے سے نہیں مل سکتی۔ اس کے لئے ٹھوس کام اور اہل وطن کو قربانی کرنے کی ضرورت ہے" ان کو گاندھی کی طرح عدم تشدد پر پورا اعتماد ہے۔ اور وشوبھارتی کے تعلیمی پروگرام میں اس کو خاص دخل ہے۔ وہ پیرانہ سالی کے باوجود نوجوانوں سے زیادہ کام کرتے ہیں۔ اور یہی ان کی درازی عمر کا راز ہے۔ وہ دُنیا اور اسکے کاموں سے الگ رہ کر نجات کے طالب نہیں ہیں۔ بلکہ دنیا میں رہ کر اپنی بے غرضانہ خدمات سے دنیا کو فیضیاب کرنا ہی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں ❖

سید حسن امام مرحوم

وہ ۳۱ اگست ۱۸۷۱ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ جہاں ان کا خاندان قریباً سات سو برس سے آباد ہے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت زیدؓ سے ملتا ہے۔ اگرچہ شرافت۔ نجابت اور علم و فضل ان کا آبائی ورثہ تھے۔ مگر چار پشتوں سے اس خاندان کو قانون سے خاص شغف و انہماک رہا ہے۔ چنانچہ ان کے پردادا سید امداد علی انگریزی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں جج تھے۔ اور ان کے جد امجد خان بہادر سید وحید الدین پہلے ہندوستانی تھے۔ جو ڈسٹرکٹ جج کے ممتاز عہدہ پر فائز ہوئے۔ ان کے والد شمس العلماء نواب امداد امام ایک بے عدیل حکیم، ایک بے مثل شاعر، ایک سحر طراز ادیب اور ایک جادو نگار مصنف ہیں۔ اور آثر تخلص کرتے ہیں۔ ان کی متعدد کتابوں کا ترجمہ مغربی زبانوں میں شائع ہو چکا ہے ؛

سید حسن امام نے ابتدائی تعلیم پٹنہ میں پائی۔ اور ۱۸۸۶ء میں انگلستان چلے گئے۔ جہاں ۱۸۹۲ء میں انہوں نے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ اور مڈل ٹمپل بار میں داخل ہو گئے۔ زاں بعد ہندوستان میں واپس آ کر پٹنہ میں پریکٹس شروع کر دی۔ ۱۹۱۱ء میں کلکتہ میں آ گئے۔ اور ۱۹۱۲ء میں کلکتہ ہائیکورٹ کے جج مقرر ہو گئے۔ ۱۹۱۶ء میں جب پٹنہ میں ہائیکورٹ قائم ہو گئی

توجہی سے مستعفی ہو کر پٹنہ میں چلے آئے۔ اور تا دم مرگ پٹنہ میں پریکٹس کرتے رہے۔
وہ قوم پرست مسلمان تھے۔ اور فرقہ دارانہ تعصبات سے ہمیشہ بالاتر رہے۔
قومی خدمات کے میدان میں انہوں نے سب سے پہلا قدم ۱۹۰۸ء میں رکھا
اور کانگرس کے اجلاس منعقدہ مدراس میں شریک ہوئے۔ اور ۱۹۱۸ء میں
بمبئی کانگرس کے صدر بنائے گئے۔ وہ انڈیا ہوم رول لیگ کے بھی صدر
تھے۔ اور ۱۹۲۱ء میں لندن کی اس کانفرنس میں بحیثیت ڈیلیگیٹ شریک
ہوئے۔ جو صلحنامہ ترکی کے سلسلہ میں منعقد ہوئی تھی۔ انہوں نے مسٹر لائیڈ جارج
وزیر اعظم کو مجبور کیا۔ کہ وہ معاہدہ سیورے میں ترمیم کریں۔ انہوں نے مسلم
یونیورسٹی علیگڈھ کے تحقیقاتی وفد کی صدارت فرمائی۔ اور قوم کے اس مایۂ ناز
ادارہ کو تباہی و بربادی سے بچا لیا۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے مع اہل و عیال
کانگرسی تحریک میں سرگرم حصہ لیا۔ اور ۱۹۳۲ء میں مجلس اقوام کے اجلاس میں
ہندوستانی نمائندہ ہونے کے فرائض انجام دیئے۔

وہ جس کام کو شروع کرتے تھے۔ اس کو ختم کئے بغیر نہ چھوڑتے تھے۔
جب وہ انگلستان میں قانونی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ تو انہوں نے مڈل
ٹمپل کی تمام لائبریری چاٹ ڈالی تھی۔ جب مسٹر ولیم ڈگبی نے ملک ویلز کا دورہ
کیا۔ تو وہ اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے ان کے معتمد خصوصی ہو گئے
۱۸۹۱ء میں جب مسٹر دادا بھائی نوروجی پارلیمنٹ کی رکنیت کے لئے
کھڑے ہوئے۔ تو انہوں نے نہایت تندہی سے مسٹر دادا بھائی نوروجی کی
امداد کی۔ اور اس اثنا میں فن خطابت کا پورا کورس ختم کر کے امتحان پاس کیا

۱۹۱۸ء میں مسز بیسنٹ نے ان کو صدر کانگرس تجویز کرتے ہوئے کہا۔ کہ:۔
"آپ نے جوڈیشل بنچ پر ہندوستانی عظمت وشان کو قایم رکھا ہے۔
آپ شاہی ہائیکورٹ کی کرسی سے اتر کر قومی ہائیکورٹ دکانگرس) میں اس لئے
تشریف لائے ہیں۔ کہ اپنی تعلیم وتربیت، اپنی ذہانت، اپنا علم وفضل،
اپنی عقل وفہم، اپنی روشن دماغی، اپنی اصابت رائے قومی خدمت کیلئے
پیش کریں"۔

آپ کی قانونی قابلیت شہرہ آفاق تھی۔ آپ کی وفات پر پٹنہ ہائیکورٹ
کے فل بنچ نے آپ کی قانونی قابلیت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا تھا:۔
"سید حسن امام نے اپنے قانونی مشوروں سے ہمیشہ ہائیکورٹ کے
ججوں کی رہنمائی کی۔ وہ علم دوست مخلص، راست گو اور حلیم الطبع تھے۔
ان کی ادبی معلومات نہایت وسیع تھیں۔ اور تاریخ وفلسفہ پر انہیں کامل
عبور تھا"۔

مسٹر آرٹ جج ہائیکورٹ پٹنہ کی رائے تھی۔ کہ" وکالت میں سید حسن امام
کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کی قابلیت نے ججوں کا کام آسان کر دیا تھا"۔

وہ حسن اخلاق کے پیکر رعنا تھے۔ باوجودیکہ ان کی ماہوار آمدن پچیس تیس
ہزار روپیہ تھی۔ مگر منکسر مزاجی ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ آداب صحبت اور
خوش اخلاقی میں لاجواب تھے۔ اور ہر شخص سے خندہ پیشانی اور خلوص کے ساتھ
ملتے تھے۔ ہر طبقہ میں ہر دلعزیز تھے۔ اگر کانگرسی ان کو اپنا لیڈر سمجھتے تھے۔ تو
غیر کانگرسی اپنا سرپرست جانتے تھے۔ کچھ عرصہ سے انہوں نے سیاسیات میں

حصہ لینا چھوڑ دیا تھا۔ مگر سیاسی واقعات میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ ان کے تدبر و سیاست دانی کا یہ حال تھا۔ کہ جس دن صبح کو وہائیٹ پیپر شایع ہوُا۔ اسی دن شام کو مسٹر سچدانند سنہا سے اس پر بحث کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور انہوں نے اس کا خلاصہ چند جملوں میں بیان کر دیا۔

۱۹ر اپریل ۱۹۳۳ء کو اس دارِ فانی سے رہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔ ان کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ اور انہوں نے بے شمار دولت اپنے پیچھے چھوڑی ہے۔
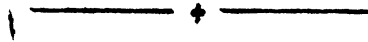
سر عبد القادر

شیخ صاحب کا وطن مالوف قصور ہے۔ وہ ۱۸۷۵ئہ میں پیدا ہوئے ان کے والد شیخ فتح الدین لدھیانہ کے محکمہ مال میں ملازم تھے۔ ان کے انتقال کے وقت شیخ صاحب پندرہ سال کی عمر کے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم کا مرکز قصور بیان کیا جاتا ہے۔ انہوں نے طالب علمی کا زمانہ نہایت کامیابی سے گذارا۔ اور ۱۸۹۴ئہ میں لاہور کے فورمن کرسچن کالج سے بی۔ اے کی ڈگری اول درجہ میں حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ لاہور کے انگریزی اخبار "پنجاب آبزرور" کے صیغہ ادارت میں شریک ہو گئے۔ اور ۱۸۹۸ئہ میں اس کے مدیر اعلےٰ بنائے گئے۔ ۱۹۰۱ئہ میں انہوں نے اُردو کا مشہور ادبی رسالہ "مخزن" جاری کیا۔ ۱۹۰۴ئہ میں وہ "پنجاب آبزرور" کی ادارت سے علیحدہ ہو گئے۔ اور بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے لئے انگلستان چلے گئے۔ اور بیرسٹری میں کامیاب ہونے کے بعد انہوں نے مغربی ممالک کا دورہ کیا۔ اور ٹرکی کی سیاحت کی۔ جہاں سے واپس آنے پر انہوں نے "مقام خلافت" کے نام سے اپنا مصور سفر نامہ لکھا۔ جو اپنی گوناگوں دلچسپیوں کا حامل ہے ٭

۱۹۱۱ئہ میں آپ لائل پور میں سرکاری وکیل بنائے گئے۔ ۱۹۱۲ئہ میں آپ لاہور واپس آ گئے۔ جہاں اپنی پرائیویٹ پریکٹس شروع کر دی۔

۱۹۲۱ء میں آپ ہائیکورٹ لاہور کے عارضی جج مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۳ء میں لیجسلیٹو اسمبلی پنجاب کے رُکن منتخب ہوئے۔ اور علی الترتیب ڈپٹی پریزیڈنٹ اور پھر پریزیڈنٹ بنائے گئے۔ ۱۹۲۵ء میں آپ کو عارضی طور پر پنجاب کی وزارت تعلیم کا قلمدان پیش کیا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں آپ ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے مجلس اقوام کے اجلاس ہفتم منعقدہ جینوا میں شریک ہوئے۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد ہائیکورٹ لاہور کے مستقل جج بنائے گئے۔ آخرکار اس منصب جلیلہ سے سبکدوش ہوکر انڈیا کونسل کے رکن مقرر ہوئے۔

اُردو زبان پر آپ نے بڑے بڑے احسانات کئے ہیں۔ اور حقیقت میں آپ اُردو کے اوّلین محسن ہیں۔ آپ نے اپنے شہرہ آفاق ادبی رسالہ "مخزن" کے ذریعہ اُردو زبان کی جو عدیم النظیر خدمات انجام دی ہیں وہ زندہ جاوید رہیں گی۔ آپ نے اُردو زبان کو نہ صرف اعلےٰ اور مفید مضامین سے مالامال کیا۔ بلکہ اردو زبان میں بیسیوں ایسے لاجواب اور قابل ترین اہل قلم پیدا کئے۔ جن پر اُردو زبان اور اُردو ادب ابدالآباد تک فخر اور ناز کرتا رہے گا۔ اس امر کا اظہار کرنا تعلّی میں داخل نہیں ہے۔ کہ آج ہندوستان کی ادبی فضاؤں میں جس قدر رنگین قلم اور رنگین بیان صحیفہ نگار ادیب پائے جاتے ہیں۔ ان کی تخم ریزی کا سہرا "مخزن" کے سر ہے۔

آپ کے طرز تحریر میں وہی سادگی موجود ہے۔ جو مولینا حالی کی تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ آپ کی تحریر میں ابتدا سے انتہا تک

تنقیدی متانت کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ ۱۸۹۸ء میں آپ نے ایک انگریزی رسالہ "اُردو ادب کا جدید دبستان" کے نام سے تصنیف کیا۔ جس میں اُردو مصنفین کے حالات مرتسم ہیں +

ڈاکٹر سر محمد اقبال

آپ ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ آپ کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو قریباً دو سو سال سے اسلام میں داخل ہو چکا ہوا ہے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ پھر مدرسے میں داخل ہوئے۔ پرائمری کا امتحان وظیفہ لے کر پاس کیا۔ مڈل کے آخری درجہ میں بھی وظیفہ حاصل کیا۔ انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ کی جماعت ایف۔ اے میں داخل ہوئے۔ جہاں عربی و فارسی کے فاضل استاد مولانا سید میر حسن کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا موقع ملا۔ جنکے فیضانِ صحبت نے آپ کے دل میں ایرانی ادب کا ذوق پیدا کر دیا۔ جو آج بھی ان کے کلام میں نمایاں نظر آتا ہے۔ سیالکوٹ کالج سے فارغ ہو کر آپ گورنمنٹ کالج لاہور کی بی۔ اے جماعت میں داخل ہوئے۔ اور فلسفیانہ طبیعت رکھنے کے باعث فلسفہ کا مضمون لے کر نہ صرف پاس ہی ہوئے بلکہ انگریزی اور عربی میں دو طلائی تمغے اور وظیفہ بھی حاصل کیا۔ ان دنوں مسٹر ڈبلیو آرنلڈ علیگڈھ کالج سے گورنمنٹ کالج میں آئے ہوئے تھے۔ جو فلسفہ کے شہرہ آفاق عالم تھے۔ انہوں نے آپ کے فلسفیانہ دماغ اور تیز فہمی کا اعتراف کیا۔ اور آپ کو شاگردی کے مراتب سے گذار کر دوستی کے

مدارج تک پہنچا دیا۔ اس زمانہ میں آپ کو غالب۔ ذوق۔ میر اور حالی وغیرہ شعرائے اُردو کا کلام پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ جنہوں نے ان کی شاعرانہ طبیعت میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اور ان کو شعر کہنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور اپنا کلام مرزا داغ دہلوی کے پاس اصلاح کے لئے بھیجنا شروع کر دیا۔ جو اس زمانہ میں نظام دکن کے استاد تھے۔ لاہور میں آکر ان کے شاعرانہ کمال کا جوہر نمایاں ہوا۔ کالج کی ہنگامہ خیز فضاؤں نے ان کے تجربہ میں وسعت اور خیالات میں رنگینی اور پختگی پیدا کر دی۔ ان کی طبیعت بچپن سے ہی فلسفیانہ تھی۔ کیونکہ ان کی پرورش تصوف کے آغوش میں ہوئی تھی ؎

ایم۔اے۔ پاس کرنے کے بعد آپ اورینٹل کالج لاہور میں فلسفہ اور سیاست مدن کے لیکچرار مقرر ہو گئے۔ پھر گورنمنٹ کالج میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ علمی مشاغل سے انتہائی شغف تھا۔ اکثر طلبہ کو اپنے مکان پر پڑھایا کرتے تھے۔ طالب علم کی حیثیت میں نیک۔ سعادتمند۔ ذہین اور محنتی تھے۔ اور استاد کی حیثیت میں مہربان اور شفیق ثابت ہوئے۔ ان کی شاعرانہ سرگرمیوں کا دور ۱۹۰۱ء سے شروع ہوتا ہے۔ جب وہ سیالکوٹ سے لاہور آئے۔ سیالکوٹ میں تو کبھی کبھی شعر کہا کرتے تھے۔ لیکن لاہور میں آکر انہوں نے زیادہ توجہ دی اور دوستوں کے مجبور کرنے پر مشاعروں میں بھی شریک ہونے لگے ؎

ایک مشاعرہ میں انہوں نے اپنی نظم "ہمالیہ" پڑھی۔ جس میں انگریزی اور ایرانی شاعری کی جھلک نمایاں ہے۔ اس وقت تک ان کی شہرت طلبہ

محدود تھی۔ لیکن اس نظم نے سارے ملک میں ان کی دھوم مچادی۔ اور ہندوستانی شاعری میں ایک نئے باب کا افتتاح کردیا۔ "ہمالیہ" میں حب وطن کا جذبہ تھا۔ وہ بجلی کی رو کی طرح ہندوستان کے طول وعرض میں پھیل گئی۔ اور بچہ بچہ کی زبان سے اس کا دلنواز ترانہ سنائی دینے لگا۔ ۱۹۰۵ء میں آپ اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان روانہ ہوگئے۔ تین سال تک وہاں رہے۔ کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ و اخلاق کی ڈگری حاصل کی۔ پھر میونک یونیورسٹی جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی (ڈاکٹر آف فلاسفی) کی ڈگری اس وقت حاصل کی۔ جب کہ آپ نے فلسفہ ایران پر ایک انگریزی کتاب لکھی۔ جو لندن میں شایع ہوچکی ہے۔ اور اس پر انگلستان کے مشہور معروف اخبارات کے عمدہ ریویو ہیں۔ جرمنی سے واپس آکر آپ لندن کے سکول آف پولیٹیکل سائنیس میں داخل ہوئے اور بیرسٹری کا امتحان کامیابی کے ساتھ پاس کیا۔ انگلستان کے دوران قیام میں علمی مصروفیت کے باوجود آپ نے اسلام پر چھ لیکچر دیئے۔ جنہوں نے قبول عام حاصل کیا۔ اور آپ کی مذہبی تحقیقات کی شہرت عام ہوگئی۔ آپ لندن یونیورسٹی میں چھ ماہ تک عربی کے پروفیسر بھی رہے۔ لندن میں ان کا تعارف میگ ٹگارٹ سے ہوا۔ جو اس زمانے کا شہرہ آفاق فلسفی تھا۔ پھر ای۔ جی۔ براؤن اور "اسرار خودی" کے مترجم ڈاکٹر نکلسن سے ملاقات ہوئی۔ میگ ٹگارٹ کے لیکچروں نے ان کو فلسفیانہ خیالات کے اظہار کا سائنٹیفک انداز سکھایا۔ براؤن اور نکلسن کی دوستی نے ان کی فارسی میں پختگی پیدا کردی۔

قیام یورپ کے زمانہ میں انہوں نے بہت کم نظمیں لکھیں۔ اور جو کچھ لکھا اس کا بہت زیادہ حصہ فارسی شاعری کے اثرات سے مالامال ہے۔ یہ ان کی شاعرانہ زندگی کا وہ زمانہ ہے۔ جب دنیا کے خواب وخیال کی جال پرور رنگینیاں دل کی پُرشوق آرزوؤں کا آب ورنگ بنتی ہیں۔ وہ محبت کی گہرائیوں میں غرق ہو جاتا ہے۔ اور محبوب مجازی کے حسن وجمال کا مشاہدہ ذراتِ فطرت میں کرتا ہے۔ مجاز میں مناظر حقیقت کی جلوہ آرائی ہوتی ہے۔ کلی۔ سلیمی۔ اور تنہائی ان کی وہ نظمیں ہیں۔ جو طلسم مجاز کو توڑ کر حقیقت کی دنیا میں پہنچی ہوئی ہیں۔ جب آپ یورپ کی مادہ پرست اور عیش پسند فضاؤں سے اکتا گئے تو انہوں نے ایک آخری نظم لکھی۔ جس میں آپ نے مغربی اقوام کو انکی مادہ پرستی پر انتباہ کیا۔ کہ

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا

اور اقوام مغرب سے کہہ دیا۔ کہ" تم نے اپنے تمدن میں مفاسد کا دروازہ کھول دیا ہے۔ تم اس آلہ سے خودکشی کرو گے جس سے تمہاری قسمت کا محل تعمیر ہوا ہے"
۱۹۰۸ء کو آپ ولایت سے ہندوستان میں واپس آگئے ۔

آپ کا ابتدائی کلام زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہے۔ مگر" بانگ درا" میں انہوں نے غزلوں کو بہت کم جگہ دی ہے۔ اسلئے وہ بھی نایاب ہیں۔ سب سے پہلے مشاعرہ میں آپ نے جو غزل پڑھی۔ اس کا مقطع یہ تھا ۔

اقبال لکھنؤ سے نہ دلّی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

ہم دیکھتے ہیں۔ کہ آج ہندوستان کے تمام شعرا اپنے آپ کو اسی سانچے میں ڈھال رہے ہیں۔ ایک مشاعرہ میں غزل پڑھتے ہوئے جب آپ اس شعر پر پہنچے۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو مولینا ارشد گورگانی مرحوم جو اس مشاعرہ میں موجود تھے۔ بے اختیار واہ واہ اور سبحان اللہ کہتے ہوئے بولے۔ "میاں اقبال یہ عمر اور یہ شعر"۔
اللہ کرے ذوقِ سخن اور زیادہ

۱۸۹۹ء میں آپ نے "نالہ یتیم" کے نام سے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں ایک نظم پڑھی۔ جو سراپا سوز و گداز کا مرقع تھی۔ اس نظم نے آپ کی شاعرانہ علمی قابلیتوں کو ملک کے کونے کونے میں روشن کر دیا۔ ملت کی عبرت انگیز تباہی کو دیکھتے ہوئے انہوں نے انجمن حمایت اسلام کے جلسہ کا پلیٹ فارم پسند کیا۔ جہاں ان کے درد انگیز نغموں اور دلگداز ترانوں نے خون کے آنسو رلائے۔ انہوں نے ملک کی حالت پر نوحہ خوانی کی۔ "ہندوستاں ہمارا"۔ "ہمالیہ" اور "نیا شوالہ" ان کی وہ بلاغت ریز اور وطن پرور نظمیں ہیں۔ جنہوں نے بلاتخصیص مذہب و ملت اہل دل اور اہل علم کو رلا دیا۔

۱۹۱۰ء و ۱۹۱۱ء میں جنگ بلقان اور جنگ طرابلس نے مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہادیں۔ اور خلافتِ اسلامیہ نوکِ خار پر پانی کا قطرہ بن گئی۔

تو اقبال کے دردمند دل میں اسلام کے لئے ایک تڑپ پیدا ہوئی۔ آپ نے نظمیں لکھیں اور محفلوں کو تڑپا تڑپا کر صفِ ماتم بنا دیا۔ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو "خونِ شہدا کی نذر" کے عنوان سے انہوں نے ایک نظم شاہی مسجد لاہور میں پڑھی۔ اس کا ایک ایک شعر تیر و نشتر تھا۔ مسلمانوں پر ایک رقّت کا عالم طاری تھا۔ اور ہر آنکھ خوننابہ باری کا خراج ادا کر رہی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے۔ جبکہ ان کی شاعری خالص اسلامی رنگ اختیار کر چکی ہے۔ اور اب وہ "ہندی ترانہ" کی بجائے "ملّی ترانہ" لکھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اور وطن کو منافیٔ اسلام قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

۱۹۲۴ء میں جبکہ امان اللہ خاں کی حکومت رفعت و عروج کی انتہائی منزلیں طے کر رہی تھی۔ ان کا "ملّی ترانہ" طلبہ کے ایک جلسہ تقسیم انعامات منعقدہ کابل میں پڑھا گیا۔ یہ دونوں ترانے بے حد مقبول ہوئے۔ بلکہ ملّی ترانہ عربی نظم کی صورت بھی اختیار کر گیا۔ ۱۹۲۷ء میں آپ کلکتہ کے گرانڈ ہوٹل میں مقیم تھے۔ جہاں امریکن سیاحوں کی ایک جماعت بھی ٹھہری ہوئی تھی۔ اور دہلی کے مشہور شاعر آغا قزلباش بھی موجود تھے۔ جن سے ایک امریکن سیاح نے دریافت کیا۔ آپ کون ہیں؟ آغا شاعر نے جواب دیا۔ میں مہاراجہ

جمال الدین کا مصاحب ہوں"۔ اس پر امریکن سیاح بول اُٹھا" کیا آپ مسٹر اقبال ہیں۔ مسٹر اقبال"۔ آپ کی عظیم الشان مقبولیت اور لازوال شخصیت کا یہ ایک ادنےٰ سا ثبوت ہے۔ اور اسی کی بناء پر ان کی زندگی میں ہی ان کے انگریزی اور اُردو سوانح حیات لکھے گئے۔ اہل علم و دماغ نے ان کے کلام پر تبصرے کئے۔ اور شعراء ان کی شان میں قصائد لکھ رہے ہیں۔ فارسی کے نامور شاعر مولانا گرامی مرحوم نے ان پر بہت کچھ لکھا۔ مگر ذیل کا شعر خصوصیت سے لایق مطالعہ ہے ؎

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیغمبر نتواں گفت

ایک اور جگہ مولانا مرحوم لکھتے ہیں ؎

درس معنی از کتاب حال گیر
ساغر از خم خانۂ اقبال گیر

سید بشیر احمد اخگر جالندھری ان کی اصنافِ شاعری کی تحسین کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

روح غالب در دمیر اقبال تیرے دل میں ہے
حسن لیلائے سخن پنہاں اسی محل میں ہے

غرض ہندوستان کے نغز گو شعراء نے آپ کے متعلق بہت کچھ لکھا۔ مولانا گرامی مرحوم نے اپنے آخری وقت میں بستر مرگ پر پڑے ہوئے (۲۶ رمئی ۱۹۲۷ء) آپ کو یاد کیا۔ اس وقت ذیل کا شعر ان کی زبان پر تھا ؎

صبا بہ حضرت اقبال ایں پیام دہ
کہ رفت جان گرامی و تو ہنوز خوش

۱۹۰۱ء میں آپ نے ملکہ وکٹوریہ کے انتقال پر ایک دردانگیز اور دلگداز نظم لکھی جس نے سرکاری حلقوں میں ایک دھوم مچادی۔ انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسہ میں اس عہد کے گورنر رونق افروز ہوئے۔ تو انہوں نے ان کی شان و علم کی تعریف میں ۱۹۰۳ء میں ایک قطعہ پڑھا۔ جنگ یورپ میں انہوں نے ایک نظم لکھی۔ جو پنجاب کے سرکاری اخبار "حق" میں شایع ہوئی۔ اور سرکاری وغیر سرکاری حلقوں میں اس کو قبول عام حاصل ہوا لیکن حکومت ان کی شاعرانہ قابلیتوں سے اس وقت شناسا ہوئی۔ جب ان کی فارسی تصانیف "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" منظر عام پر آئیں۔ اور ان کے ترجمے یورپ کی متعدد زبانوں میں شایع ہوئے۔ اس وقت آپ کو حکومت کی طرف سے نائٹ (سر) کا عظیم المرتبت خطاب ملا۔

اواخر دسمبر ۱۹۲۸ء میں آپ چند لکچر دینے کے لئے مدراس میں مدعو کئے گئے۔ اور تین دن تک وہاں قیام کیا۔ مختلف مجالس و محافل نے آپکو ایڈریس پیش کئے۔ مدراس۔ بنگلور اور میسور کے انگریزی اُردو جرائد و صحائف نے ان کے فوٹو شایع کئے۔ اخبارات کے نمائندوں اور مذاہب کے علماء نے ان سے مذہب۔ فلسفہ اور سیاسیات پر تبادلۂ خیالات کیا۔ انجمن ترقیٔ اُردو کے علاوہ ہندی پرچار سبھا اور برہمن علماء نے آپ کو سپاسنامے پیش کئے۔ ۹ر جنوری ۱۹۲۹ء کو جب آپ بنگلور کے سٹیشن پر آئے۔ تو ہزاروں انسانوں نے

اس نامور عالم اور شاعر کا تعارف کیا۔ مسلم لائبریری کی طرف سے امین الملک دیوان مرزا اسمٰعیل وزیر اعظم میسور کی صدارت میں آپ کو ایڈریس دیا گیا۔ مہاراجہ میسور کے دعوت نامہ پر آپ میسور پہنچے۔ اور حکومت کے مہمان خانہ میں فروکش ہوئے۔ میسور یونیورسٹی نے آپ کے لیکچر کا انتظام کیا۔ مسلمانوں نے اپنا ایڈریس پیش کیا۔ جہاں ہندو بھی مدعو تھے۔ ۱۴ر جنوری کو آپ حیدر آباد پہنچے۔ جہاں مسلمان بچوں نے "چین وعرب ہمارا ہندوستاں ہمارا" کا ترانہ ملی پڑھ کر آپ کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ سٹیشن پر عثمانیہ یونیورسٹی کے جملہ ارکان رونق افروز تھے۔ ۱۸ر جنوری کو آپ حضور نظام سے ملے۔ اخبارات نے ان کی علمی اور شاعرانہ قابلیت پر مضامین لکھے۔ اور ان کی تصویریں شائع کیں۔ اخبار "الکلام" میسور نے "اقبال نمبر" چھاپا۔

آپ کی سب سے پہلی تصنیف اُردو میں "علم الاقتصاد" کے عنوان سے چھپ چکی ہے۔ جو اس وقت نایاب ہے۔ انگلستان میں آپ نے ایک کتاب "فلسفہ ایران" پر لکھی۔ جس کی بنا پر ان کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی۔ جب انگلستان سے آپ وطن میں آئے۔ تو انہوں نے دو مثنویاں "اسرار خودی" اور "رموز بےخودی" شایع کیں۔ اپنا اُردو مجموعہ کلام "بانگ درا" کے عنوان سے شایع کیا۔ پھر "پیام مشرق" اور "زبور عجم" شایع ہوئیں۔ جنہوں نے انکی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر پہنچا دیا۔ ۱۹۲۹ء میں آپ نے مدراس میں چھ لکچر دیئے تھے۔ وہ بھی کتابی صورت میں شایع ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں "جاوید نامہ" شایع ہوا۔ حال ہی میں "بال جبریل" کے عنوان سے آپ کی اُردو نظمیں

جس پر وطن کا ہر فرد فخر و مباہات کر سکتا ہے۔ ان کی فلسفیانہ شاعری کے مبادیٔ اصول الٰہیات کی پیداوار ہیں۔ انہوں نے اسرار و رموز ایسے جواہر گراں مایہ بکھیرے ہیں۔ کہ ان سے دماغ کی بجائے دل متاثر ہوتا ہے۔ ان کے اندر منطق کے خشک مسائل نہیں ہیں۔ بلکہ پھولوں کی تابش اور رنگینی موجود ہے۔ اور ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاعر ان انسانوں کا عاشق ہے جن کی روح آزاد اور جن کی نظر وسیع ہے۔ پیام مشرق گوئٹے کے دیوان مشرقی کے جواب میں ہے۔ جس میں چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں۔ اور زبور عجم ایک طویل نظم کے دو حصے ہیں۔ جن میں اسرار اور رموز کا فلسفہ تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ اقبال کی شاعری فلسفیانہ اور پُر کیف ہے۔ اس کا تخیل بہت بلند ہے۔ اور بعض اوقات ان کے خیالات کی پیچیدگیوں میں سطحی نظر رکھنے والے انسان گم ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی نظموں کو بہت مشکل سے سمجھتے ہیں۔

وہ بلاشبہ ایک سحر طراز ادیب، ایک اعجاز پرور شاعر، ایک ریفارمر۔ اور ایک فلسفی تھے۔ جنہوں نے وطن اور ملت کی مکدّر فضاؤں کو اپنے علم و فضل کی روشنی سے منوّر کر دیا۔ اور وطنی شاعری میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا۔

افسوس! آسمان علم و ادب کا وہ خورشید درخشاں ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ جس کی ضیا باریاں دنیائے اسلام کو جگمگا رہی تھیں۔ جو اسلامیان کا ایک متبحّر عالم۔ بے مثال مدبّر اور بے نظیر مفکّر تھا۔ اور ایک صائب الرائے سیاست دان تھا۔ گول میز کانفرنس میں انہوں نے اپنے گرانقدر خیالات کا

اظہار نہایت جرأت اور بے باکی سے کیا۔ وہ ایک بلند مرتبت فلسفی تھے۔ وہ یگانۂ روزگار شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں رجائیت تھی۔ درس عمل تھا۔ اور جذبہ خودداری تھا۔

وہ گذشتہ چند سال سے بیمار چلے آرہے تھے۔ ڈاکٹر ان کی صحت کے متعلق کامل مایوسی کا اظہار کر چکے تھے۔ مگر حکیم عبدالوہاب صاحب انصاری کی توجہ سے ان کی عام صحت اچھی رہی۔ تین ماہ گذشتہ سے ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ دردِ کمر کے ساتھ ورم کی شکایت شروع ہو گئی۔ اسی عرصہ میں حکیم محمد حسن قرشی لاہوری کا علاج ہوتا رہا۔ دیکھنے والوں کو یہ وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ کہ ملت اسلامیہ کا یہ گنج شائگاں اتنی جلدی لٹ جانیوالا ہے۔

۱۷ اپریل ۱۹۳۸ء کو ایک طبی بورڈ نے ان کا معائنہ کیا اور انگریزی علاج شروع ہوا۔ مگر طبیعت سنبھالے نہ سنبھل سکی۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو رات کے دس بجے طبی بورڈ نے پھر معائنہ کیا۔ جس میں ڈاکٹر کرنل امیر چند بھی تھے۔ اور ان کی رائے کے مطابق ۲۱ اپریل کی صبح کو انہیں ٹیکہ لگایا جانا تھا۔ صبح پانچ بجے ان کو فروٹ سالٹ کی ایک خوراک دی گئی۔ اور ان کی طبیعت یکایک خراب ہو گئی۔ سینہ میں ایک شدید درد اٹھا۔ اور ان کی روح کو قفس عنصری سے اڑا کر لے گیا۔

انتقال سے بارہ گھنٹے پہلے ۲۰ اپریل کی شام کو ان کے ایک پرانے ادیب اور سیاست دان جرمن دوست ملاقات کے لئے آئے اور سیاست حاضرہ پر دلچسپ گفتگو ہوتی رہی۔ جب اس جرمن دوست نے ان کی صحت کے متعلق

دریافت کیا۔ تو انہوں نے جواب دیا۔ کہ" میں مسلمان ہوں۔ اور موت سے قطعاً نہیں ڈرتا جب موت آئے گی۔ تو مجھے متبسم پائے گی"۔ اس وقت ان کا چہرہ بشاش اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی ؎

آپ کی وفات کی خبر مشتہر ہوتے ہی تمام اسلامی اداروں نے تعطیل کا اعلان کر دیا۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے تمام ادارے۔ بلدیہ لاہور کے دفاتر اور مدارس اسی وقت بند کر دیئے گئے۔ بلدیہ امرت سر کے تمام دفاتر اور مدارس ۲۱ر اور ۲۲ر اپریل کو بند رہے۔ انجمن اسلامیہ امرت سر کے تمام ادارے اس ماتم میں بند رہے ؎

ٹھیک ۵ بجے ان کے جنازہ کا جلوس شاہی مسجد کی طرف روانہ ہوا۔ جس میں تمام اکابر قوم، زعمائے ملت، وکلا، بیرسٹر۔ تاجر۔ دکاندار۔ وزرا، حکام اعلیٰ طلبہ۔ اساتذہ۔ اخبار نویس۔ اہلکار اور کارخانہ دار شریک تھے۔ یہ جم غفیر پچاس ہزار سے زائد ہوگا۔ جنازہ کا جلوس برانڈرتھ روڈ سے نکل کر سرکلر روڈ پر دہلی دروازہ کی جانب روانہ ہوا۔ اور کشمیری بازار۔ ڈبی بازار اور رواٹروگس سے ہوتا ہوا شاہی مسجد میں پہنچا۔ شام کے آٹھ بجے نماز جنازہ ادا کی گئی اور اس عظیم المرتبت ہستی کو مسجد کے صدر دروازہ کی سیڑھیوں کے دائیں جانب بسمت جنوب سپرد خاک کر دیا گیا ؎

مرحوم نے موت سے کچھ وقت پہلے ذیل کا شعر اور رباعی کہی تھی۔ جو ان کی شاعری کی آخری یادگار بیان کی جاتی ہے ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

رباعی :-

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

مرحوم نے موت سے چند روز پہلے ایک مضمون مولانا حسین احمد کے اس خیال کی تردید میں لکھا۔ کہ اقوام وطن سے بنتی ہیں۔ یہ مضمون اتنا بلند پایہ ہے۔ کہ مسلمانوں کے لئے صحیح راہِ عمل کا کام دے سکتا ہے۔

ان کی تصانیف ہیں جاوید نامہ۔ پیام مشرق۔ بانگ درا۔ ضرب کلیم۔ بالِ جبریل۔ مسافر۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق۔ زبورِ عجم۔ ری کنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ اِن اسلام۔ ایسی کتابیں ہیں۔ جو ان کے نام کو زندہ جاوید کرتی رہینگی۔

مرحوم نے اپنے پیچھے دو صاحبزادے آفتاب اقبال اور جاوید اقبال اور ایک صاحبزادی منیرہ بانو چھوڑے۔ مرحوم ۱۸۷۶ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء صبح کے پانچ بجے باسٹھ سال کی عمر میں جاوید منزل لاہور میں انتقال کیا۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ آپ کے انتقال سے ہندوستانی قوم کے اندر جو کمی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کی تلافی صدیوں نہیں ہو سکتی۔ لیکن جب تک دنیا قایم ہے۔ اقبال کا کلام زندہ ہے۔ اقبال کا ذوقِ عمل زندہ ہے اور اقبال کا نام زندہ ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

سر میاں فضل حسین

وہ ۱۴ جون ۱۸۷۷ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ بٹالہ ضلع گورداسپور کے بھٹی راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد میاں حسین بخش صاحب ان دنوں پشاور میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدہ پر فائز تھے اور بعد ازاں ایبٹ آباد میں تبدیل ہو کر چلے گئے میاں فضل حسین کی ابتدائی تعلیم میونسپل بورڈ سکول ایبٹ آباد میں ہوئی۔ یہاں وہ ایک معمولی طالب علم کی حیثیت رکھتے تھے۔ چھ سات سال کی عمر میں انہیں شدید درد معدہ ہوا۔ جس کے باعث وہ کئی ہفتہ تک سکول میں نہ جا سکے جب انہوں نے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ تو ان کی صحت پھر خراب ہو گئی۔ اور وہ عرصہ تک سکول سے غیر حاضر رہے۔ آخر کار میونسپل بورڈ سکول ایبٹ آباد سے ہائی اسکول پشاور میں چلے گئے۔ بعد ازاں گورنمنٹ ہائی اسکول گورداسپور میں داخل ہوئے۔ یہاں انہوں نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اور گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو کر چار سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اور ۱۸۹۸ء میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کی۔

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد وہ انگلستان چلے گئے اور وہاں کرائسٹ کالج میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۰۱ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ پھر انڈین سول سروس کے

امتحان میں شریک ہوئے۔ مگر ناکام رہے۔ انگلستان کے زمانۂ قیام میں انہوں نے برطانیہ کی تاریخ۔ وہاں کی ادبی فضا۔ اور وہاں کے طریق حکومت کا بنظر غائر مطالعہ کیا۔ وہاں کی سیاسیات اور اہل برطانیہ کے اخلاق و عادات کا جائزہ لیا اور عہد ماضی کے مصلحین قوم کے سوانح حیات کو دلچسپی سے پڑھا۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں وہ ہندوستان میں واپس آگئے۔ اور سیالکوٹ میں اپنی قانونی پریکٹس شروع کر دی۔ چار سال تک وہ سیالکوٹ میں رہے۔ اور یہاں کے مسلمانوں کی تعلیمی پستی کو دیکھ کر انہوں نے انجمن اسلامیہ کے نام سے ایک انجمن قایم کی۔ جس کے ماتحت ایک چھوٹا سا سکول جاری کر دیا۔ جو اس وقت ہائی اسکول کے درجہ تک پہنچا ہوا ہے۔ سیالکوٹ میں انہوں نے پنجاب کی مشہور و معروف انجمن حمایت اسلام لاہور کا رکن بن کر عظیم الشان کارہائے نمایاں دکھائے۔ انجمن کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں ان کی تقریریں خصوصیت سے ہنگامہ خیز ہوا کرتی تھیں اور حاضرین کو اپنے اثرات سے متاثر کیا کرتی تھیں۔ ان کا سب سے پہلا لیکچر "انگلستان سے ایک پیغام" کے عنوان سے ہوا دوسرے اور تیسرے سال انہوں نے "مذہب اور اصلاح" کے موضوع پر لیکچر دیئے۔ یہ تینوں لیکچر انگریزی میں تھے۔ جو نہایت مقبول ہوئے اور پوری دلچسپی سے سنے گئے۔

سنہ ۱۹۰۵ء میں وہ پنجاب کے دارالسلطنت لاہور میں وارد ہوئے۔ انہوں نے دو سال تک سیاسیات میں کوئی حصہ نہ لیا۔ اور اپنا سارا وقت اسلامیہ کالج لاہور کے اعزازی پرنسپل کی حیثیت سے مشاغل علمیہ میں گذارا۔ اسکے بعد

وہ انجمن اسلامیہ لاہور کی کالج کمیٹی کے سکرٹری (معتمد) منتخب کئے گئے۔ اور
قریباً پندرہ سال تک نہایت قابلیت سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔
پھر وزیر پنجاب کی حیثیت سے منظر عام پر آئے۔ اور ۱۹۰۷ء میں میدان سیاست
کے شہسوار بن کر نکلے۔ وہ زیادہ دیر تک انجمن حمایت اسلام کی کمیٹیوں اور
سب کمیٹیوں اور اسلامیہ کالج کے تعلیمی نظام کو اپنے ہاتھوں میں نہ رکھ سکے
زاں بعد پنجاب یونیورسٹی کے فیلو منتخب کئے گئے۔ اور متعدد تعلیمی اداروں
کے رکن بنائے گئے۔ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۵ء تک وہ اولین مشیر قانون ،
ثانوی ماہر تعلیم اور آخری سیاست دان تھے۔ اور نہایت ملنسار خلیق اور
ہمدرد مسلمان تھے ؞

۱۹۱۵ء میں انہوں نے اپنے آپ کو لیجسلیٹو کونسل پنجاب کے انتخاب کے لئے پنجاب
یونیورسٹی کی مجلس میں پیش کیا اور امید ظاہر کی۔ کہ یونیورسٹی کے ووٹران کی
بین الاقوامیت ان کی آزاد منشی۔ راستبازی اور بے لوث شخصیت کی قدر
کریں گے۔ کیونکہ اس وقت صوبہ میں تفریق قومیت اپنی ہولناکیوں کے مناظر
دکھا رہی تھی۔ یونیورسٹی کے ووٹروں نے یقین دلایا تھا۔ کہ وہ ان کی ہر ممکن
طریق سے حمایت کرینگے۔ لیکن جن ممتاز ہندو ووٹروں نے اپنی امداد و اعانت کا
یقین دلایا تھا۔ وہ سب کے سب منحرف ہو گئے۔ اور انہوں نے ہندو امیدواروں
کے خلاف ان کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ یونیورسٹی کے تیس ۳۰ ممتاز
ہندوؤں سے ملے۔ جنہوں نے ان کو ایک بہترین امیدوار تسلیم کیا۔ لیکن
ستائیس نے ان کی کوئی امداد نہ کی۔ جس سوسائٹی سے وہ تعلق رکھتے تھے۔

ان کی منشاء اور ان کے فیصلہ کے خلاف انہوں نے کوئی پیشقدمی نہ کی۔ صرف تین ہندو لیڈروں نے وعدہ کے مطابق ان کا ساتھ دیا۔

وہ نہایت قلیل آراء سے کامیاب ہوئے۔ کیونکہ مسلمانوں کے تمام ووٹ انہی کے حق میں تھے۔ ان کی مضبوط اصابت رائے اور بنیادی بین الاقوامیت نے اپنے احساسات کو تلخ کرنے اور اپنی حب الوطنی کے جوش کو کم کرنے کے لئے اس متاسفانہ سرگذشت کا اعادہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ ہندو مسلمانوں کے عام سیاسی جذبات کو ابھارنے کے لئے زیادہ سے زیادہ حصہ لیا۔ تاہم ان کی زندگی کا اولین مقصد یہ تھا۔ کہ وہ مسلمانوں کی اقلیت کو ملحوظ رکھ کر مشترکہ انتخاب کا سوال اپنے ہاتھوں میں لیں۔ اور مسلمانوں کو اپنی بہترین رائے ملک کی قومی زندگی میں تقسیم کرنے سے روکیں یہ تحریک فضول ہی نہ تھی۔ بلکہ مسلمانوں کے لئے خصوصیت سے خطرناک تھی۔ وہ قومی نقطۂ نظر سے اس طریق انتخاب میں تبدیلی کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ گورنمنٹ کی بظاہر پالیسی یہ تھی۔ کہ وہ لوگوں کو فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے کچھ تعلیمی سہولتیں بہم پہنچائے۔ مسلمان اپنے ہندو بھائیوں سے تعلیم میں بہت پیچھے تھے۔ اسلئے اس امر کا اندیشہ تھا۔ کہ مشترکہ انتخاب کی یہ پالیسی مسلمانوں کو سرکاری ملازمت، سرکاری تعلیمی امداد اور دیگر سرکاری سہولتوں میں چند قدم اور پیچھے نہ ہٹا دے، اسلئے انہوں نے اس مسئلہ کی طرف خاص طور پر توجہ دی۔ اور پوری طاقت سے اس پر ڈٹے رہے۔ آپ نے اس پالیسی کو ایک کانگرسی لیڈر کی حیثیت سے ایڈووکیٹ کیا اور ایک وزیر اور پارلیمنٹری لیڈر کی طرح اسمیں جذب ہوگئے

مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ کہ وہ ہمسایہ قوم کی اس سیاست سے محفوظ رہیں۔ ہندو مسلم سوال کو حل کرنے کے لئے ہندوستان کے مشہور لیڈروں کی رائے تھی۔ کہ ہندو مسلم یا کانگرس لیگ پیکٹ لکھنؤ مرتب کیا جائے۔ سر فضل حسین بھی اس میں شریک تھے۔ اور اس پیکٹ کے واضعین میں سے تھے۔ جو مختلف صوبجات میں سیاسی کانفرنسوں کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ اس مطلب کے لئے اکتوبر ۱۹۲۳ء کو پنجاب میں ایک کانفرنس بھی ان کی زیر صدارت ہوئی۔ جو بہت کامیاب ثابت ہوئی ؛

۱۹۱۵ء میں پنجاب کے لفٹنٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر تھے۔ اس وقت ایک طرف یورپ کی جنگ عظیم اپنی ہولناکیوں کے نظارے پیش کر رہی تھی اور دوسری طرف ہندوستان میں ریفارم سکیم کا فیصلہ کیا جا رہا تھا۔ ہوم رول کے لئے ایک عظیم انقلاب برپا تھا۔ مسز بیسنٹ آنجہانی اس کی رہنمائی کر رہی تھیں۔ حکومت نے مسز بیسنٹ و ران کے ساتھیوں کے آزاد پروپیگنڈا کو ہندوستان کے لئے خطرناک سمجھا۔ اور ان کی تقریروں کو امن عامہ کے منافی قرار دیا۔ سر مائیکل چاہتے تھے۔ کہ یہ سیاسی ایجی ٹیشن پنجاب میں نہ پھیلنے پائے انہوں نے حکومت خود اختیاری کا علم بلند کرنے والے سیاسی لیڈروں کو تبلایا کہ وہ ان کے اور ان کے خیالات کے لئے عملی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان کی خواہش یہ تھی۔ کہ پنجاب ان سیاسی تغیرات سے مامون و محفوظ رہے' اس وقت اقطاع ہند میں رونما ہیں۔ انہوں نے اپنی حکومت پر ثابت کر دیا۔ کہ پنجاب میں کسی ریفارم سکیم کی ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے اخبارات اور تقریروں پر

انتہائی پابندیاں عائد کر دیں۔ اور پنجاب میں دوسرے صوبوں سے آکر سیاسی پروپیگنڈا کرنے والے لیڈروں کا داخلہ بند کر دیا۔

سر فضل حسین نے اس خطرہ کو محسوس کر کے اپنے آپ کو اس میدان میں پیش کیا۔ اور پنجاب میں انڈین نیشنل کانگرس کی ایک شاخ قایم کر کے لفٹنٹ گورنر کی تجاویز کے خلاف باقاعدہ جنگ شروع کر دی۔ ان کے سرکاری دوست ان کے راستہ میں حائل ہوئے۔ مگر انہوں نے اپنے صوبہ کا سیاسی مستقبل تاریک نہ کرنا چاہا۔ البتہ وہ یہ نہیں چاہتے تھے۔ کہ قانونی حدود کو توڑ کر بغاوت انگیز طریقہ اختیار کیا جائے۔ ان حالات میں ان کا وسیع تجربہ بہت کامیاب ثابت ہوا۔ اور انہوں نے ظاہری و باطنی طور پر اپنے خیالات میانہ روی کے ساتھ ظاہر کرنا شروع کر دیئے۔ اور پنجاب کی بہترین رہنمائی کی۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو لاہور میں ان کی زیر صدارت ایک کانفرنس ہوئی جس نے سیاسی تحریکات کا ایک نیا باب کھول دیا۔ لالہ ہرکشن لال اس کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ ان کا خطبۂ صدارت پنجاب و ہند میں حیرت انگیز طور پر مقبول ہوا۔ جس میں انہوں نے مقامی حکومت کو ان سیاسی پابندیوں اور سختیوں کا پورا جواب دیا۔ اور سر مائیکل کی اس رائے کا مدبرانہ طور پر رد کیا۔ کہ "پنجاب میں ریفارم سکیم کی کم از کم ضرورت بھی نہیں ہے۔

پندرہ سال کے بعد جب سر مائیکل اوڈوائر نے مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی

میں شہادت دی۔ اور ریفارم سکیم کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا تو کمیٹی کے ہندوستانی نمائندوں نے آپ سے پوچھا۔ کہ آپ کی سر فضل حسین کے متعلق کیا رائے ہے۔ جو صوبہ پنجاب میں وزارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ تو سر میکائل نے ان کے ادائے فرض کی داد دی۔ ۱۹۱۵ء میں پنجاب میں رولٹ ایکٹ کے خلاف ایک نفرت انگیز جذبہ پیدا ہوا۔ جو آئینی حدود سے نکل گیا۔ اس موقع پر آپ کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ اور آخر کار یہ سیاسی سرگرمیاں مارشل لا کے حربہ سے دبا دی گئیں۔ اب کانگرس عدم تعاون کا پروگرام لے کر میدان میں آئی۔ ۱۹۲۰ء میں امرت سر میں ایک سیاسی کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس نے پنجاب کو اس نئے پروگرام پر عمل کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اس تحریک کے خلاف اقدام کیا اور ۱۹۱۷ء کی طرح ۱۹۲۰ء میں بھی یہ اقدام بروئے کار نہ آیا۔ اور وہ تحریک عدم تعاون پر قابو نہ پا سکے۔ لیکن ان کی مساعی جمیلہ نے اسلامیہ کالج کو اس تحریک سے الگ کر لیا۔ جہاں انہوں نے ۱۴۔۱۵ سال تک اپنے فرائض انجام دیئے تھے۔ بلکہ ڈی۔ اے وی کالج لاہور کو بھی اس زہریلی تحریک کے حملہ سے بچا لیا۔ ۲ جنوری ۱۹۲۱ء کو انہوں نے قلمدان وزارت اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور اپنی تمام تر توجہ اس کی طرف مرکوز کر دی۔ دوسرے صوبوں کے وزرا کانگرس کے عدم تعاون کے پروگرام کو سروش غیبی سمجھتے تھے۔ مگر آپ نے ثابت کر دیا۔ کہ ایک کانگرسی جو عامۃ الناس کے مفاد کا مدعی ہے۔ جب قوت حاصل کر لیتا ہے۔ تو وہ ان کے مفاد کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ لیجسلیٹو کونسل کے

نمائندے بھی ان کی رہنمائی کی دلی قدر کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں انہوں نے ایک پارلیمنٹری جماعت قایم کی۔ جو نیشنل یونینسٹ پارٹی کے نام سے موسوم ہوئی۔ اور وہ خود اس کے قائد بنے ؛

وہ تعلیم۔ طب اور لوکل سیلف گورنمنٹ کے محکموں کے انچارج تھے انہوں نے اپنے عہد وزارت میں سکولوں۔ کالجوں۔ ہسپتالوں۔ اور لوکل سیلف گورنمنٹ کے لئے نمایاں کام کئے اور بلا تفریق قومیت کئے۔ گاؤں کے مدارس اور ہسپتالوں کو ترقی دی۔ جب زمینداروں کی حالت گرنا شروع ہوگئی۔ تو آپ نے تخفیف مالیہ میں ضروری حصہ لیا۔ صوبہ پنجاب میں پرائمری تعلیم مفت کر دی۔ طبی امداد کو صوبہ بھر میں وسعت دی۔ خصوصاً قصبات میں محکمہ صحت عامہ کے ذریعہ ملیریا اور ہیضہ کے انسداد کے لئے پوری مدد دی۔ اور ضروری مرکزوں میں نئے ہسپتال کھول دیئے۔ ۱۹۲۱ء میں دس لاکھ اور ۱۹۲۶ء میں بیس لاکھ روپیہ صحت عامہ کے لئے وقف کر دیا۔ لوکل سیلف گورنمنٹ کے ضمن میں انہوں نے بلدیات کا افتتاح کیا۔ قصبات میں سمال ٹاؤن کمیٹیاں قائم کر دیں۔ اور ان میں انتخاب کا طریق رائج کر دیا لاہور و امرت سر جیسی بلدیات کے لئے ایک ٹاؤن امپروومنٹ ایکٹ مرتب کیا۔ مگر یہ ایکٹ ان کے عہد وزارت میں پاس نہ ہوسکا۔ پنجاب کے دیہات کے لئے پنچایت ایکٹ پاس کیا گیا۔ جس سے دیہاتیوں کی طاقت مضبوط ہوگئی۔ یہ ایکٹ انہوں نے اپنی وزارت کے آخری ایام میں پاس کرایا۔ اگرچہ بعد میں لوگ اس پر عمل کرنے سے قاصر رہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ

انہوں نے کس قدر دیانت داری کے ساتھ کانگرس کے پلیٹ فارم پر اپنی ملی و وطنی خدمات کو انجام دیا۔ یونینسٹ پارٹی کے اجتماعات میں ہنگامہ خیز تقریریں کیں۔ اور ان جماعتوں کو سرکاری مراعات سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔ جو تعلیمی نقطۂ نگاہ سے دوسری جماعتوں سے پیچھے تھیں "

وہ پانچ سال تک وزارت کے عہدہ پر متمکن رہے۔ اوائل ۱۹۲۶ء میں حکومت پنجاب کے ایک ریونیو ممبر کی جگہ خالی ہوئی۔ جو آپکو پیش کی گئی اور ریلینڈ ریونیو اور آبپاشی کے اس محکمہ کی نگرانی آپکے سپرد ہوئی۔ کیونکہ تعمیر قومی کے لئے آپ کی شخصیت نہایت موزوں تھی۔ آپ نے سب سے پہلے ریونیو ایکٹ مرتب کیا۔ جو اس وقت تمام اضلاع میں بہترین قانون سمجھا جاتا ہے۔ کمیٔ پیداوار کے نتیجہ میں آپ نے مالیہ اور معاملہ نہر معاف کردیا اور گورنر پنجاب نے اس پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ اس ضمن میں آپ کو بہت سی تجاویز پر اختیارات حاصل تھے۔ جن میں تقاوی بھی شامل تھی۔ ۱۹۲۷ء میں وہ چند ماہ کے لئے اپنے ادائے فرض سے اس لئے الگ ہوگئے کہ وہ ہندوستان کی نمائندگی کے لئے لیگ آف نیشن کی اسمبلی میں منتخب کئے گئے تھے۔ جہاں انہوں نے امید سے بڑھ کر حق نمائندگی ادا کیا۔ ۱۹۲۹ء میں پھر چند ماہ کے لئے پنجاب سے غیر حاضر رہے۔ جبکہ ان کو گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل میں ایک عارضی جگہ پیش کی گئی۔ ۱۹۳۰ء کے موسم بہار میں وہ پانچ سال کے لئے اس جگہ پر مستقل کئے گئے۔ اس وقت کانگرس کی تحریک عدم تعاون زوروں پر تھی۔ اور ملک کی مختلف جماعتیں مختلف طریقوں سے

نئے آئین میں تبدیلی کے لیئے سرگرم عمل تھیں۔ انہوں نے اس موقع پر ایک نئی جنگ کا آغاز کر دیا۔ اور جہاں وہ ہندوستان کے سیاسی حقوق کی ممکن تبدیلی کے خواہشمند تھے۔ وہاں ان کی یہ بھی تمنا تھی۔ کہ یہ حقوق ہندوستانی ترقی یافتہ قوم کے حصہ میں نہ آئیں۔ بلکہ آبادی کے لحاظ سے تمام جماعتوں میں تقسیم کئے جائیں۔ وہ تن تنہا اس میدان میں نکلے۔ انہوں نے ہندوستان اور انگلستان کی تحریکات کا مطالعہ کیا۔ اور اس بارے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ معاً شمال مغربی سرحدی صوبہ میں سیاسی بدامنی پیدا ہو گئی۔ اور وہ حکومت ہند کے رکن بنا دیئے گئے۔ اس وقت پشاور کے بازاروں میں فوجی پہرہ تھا۔ اور قصہ خوانی بازار میں گولی چل چکی تھی۔ وہ جون ۱۹۳۰ء میں پشاور گئے۔ اہل پشاور اور حکومت کے درمیان سمجھوتہ کرا دیا۔ اور صوبہ سرحد کے لیئے ریفارم سکیم کی بنیاد ڈال دی۔ زاں بعد گورنمنٹ کے مسلم رکن کی حیثیت سے انہوں نے گول میز کانفرنس کے لیئے ان مسلم ڈیلیگیٹوں کا نام تجویز کیا۔ جو بحیثیت مجموعی اپنے فرائض کو قابلیت سے انجام دے سکیں۔ اور ان کا یہ انتخاب کامیاب ثابت ہوا۔

کانگرس کے لیڈر مختلف طریقوں سے کام کر رہے تھے۔ اور نئے آئین کے لیئے فرقہ دارانہ تحفظ کا مسئلہ الگ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ ہندوستان میں اور گول میز کانفرنس لندن میں اسلامی حقوق کی حفاظت کرنا چاہتے تھے۔ اسلیئے انہوں نے کانگرس اور اس کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ اس دوران میں ان کی صحت خراب ہو گئی۔ اور ۱۹۳۲ء میں وہ چند ماہ کی

رخصت لے کر ایبٹ آباد چلے گئے۔ ان کی واپسی پر پبلک سروس کا فرقہ وارانہ سوال پھر حکومت ہند میں اٹھایا گیا۔ اگرچہ آپ نئے آئین کے نافذ ہونے سے پہلے اس سوال کے حل کئے جانے پر بہت متفکر تھے۔ مگر قدرتاً یہ سوال دو سال تک زیر غور رہا۔ اور اس کا فیصلہ اس وقت ہوا جبکہ وہ اپنے عہدہ کی میعاد ختم کرنے والے تھے۔ اور یہ فیصلہ ان کے حسب مراد ہوا۔ کہ تناسب آبادی اور قومیت کے لحاظ سے ملازمتیں دی جائیں ؛

۱۹۳۱ء میں انہوں نے ایک قانون مرتب کیا۔ کہ گندم پر غیر ملکی محصول لگایا جائے۔ اس قانون نے پنجاب کے کسانوں کی بہت مدد کی۔ اگرچہ یہ قانون ابتداءً مختصر وقت کے لئے تھا۔ لیکن گذشتہ چند سالوں میں وقتاً فوقتاً اس کی تجدید ہوتی رہی۔ وہ یکم اپریل ۱۹۳۱ء کو حکومت ہند کی رکنیت سے علیحدہ ہو گئے۔ چودہ سال کے عرصہ میں وہ ایک عہدہ سے دوسرے عہدہ پر حیرت انگیز طور پر ترقی کرتے رہے۔ اور انہوں نے اپنے وقت میں قومی تعمیر کا بنیادی کام کیا۔ ان کی زندگی کا ابتدائی مرحلہ یہ تھا۔ کہ انہوں نے گورداسپور میں ایک چھوٹا سا اسلامیہ سکول کھولا۔ اور ان کا آخری کام یہ تھا۔ کہ انہوں نے ملک کے کونے کونے میں علم کی روشنی پھیلا دی۔ اور سیاسی پروگرام کی مدبرانہ تکمیل کی ان کی زندگی کا اہم ترین مقصد یہ تھا۔ کہ ہندوستان خواب گراں سے بیدار ہو جائے اور اس میں وہ بہت حد تک کامیاب ہوئے۔ تعلیمی فرائض ادا کرنے کے صلہ میں ان کو "خان بہادر" کا خطاب ملا۔ ۱۹۲۹ء میں "کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔" اور ۱۹۳۲ء میں "کے۔ سی۔ ایس۔ آئی" بنائے گئے۔ پنجاب یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی

اور دہلی یونیورسٹی نے ڈی۔لٹ D.LITT کی ڈگری دی۔ اگرچہ وہ آنریبل ڈاکٹر سر فضل حسین کے۔سی۔آئی۔ای۔ اور کے سی۔ایس۔آئی تھے۔مگر ان کی کوٹھی پر جو بورڈ چسپاں رہتا تھا۔ اس پر صرف میاں فضل حسین لکھا ہوتا تھا۔اور وہ اس کو زیادہ پسند کرتے تھے۔کیونکہ شہرت کی انہیں تمنا نہ تھی۔ ۱۹۳۶ء میں ان کی صحت بہت خراب ہوگئی۔ اور جب وہ شملہ سے لاہور واپس آئے۔تو شدید درد گردہ میں مبتلا ہو گئے ۔ ایک ہفتہ تک موت وحیات کی کشمکش میں رہے۔آخر ۹ جولائی ۱۹۳۶ء کو رات کے ساڑھے دس بجے اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔ان کی موت کی اولیں اطلاع ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کی طرف سے براڈکاسٹ کی گئی۔ اور چند منٹوں کے اندر اندر یہ خبر شملہ کی وادیوں میں پہنچ گئی۔ دوسری صبح ہندوستان کے اس مایہ ناز مسلم لیڈر کا جنازہ اسلامیہ کالج کے وسیع احاطہ میں لایا گیا۔ اور نماز جنازہ ادا کی گئی پھر ان کو بٹالہ میں ان کے خاندانی قبرستان میں ہمیشہ کے لئے سپرد خاک کیا گیا ؛

مولانا محمد علی مرحوم

رئیس الاحرار مولانا محمد علی ۱۸۷۸ء میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد عبدالعلی خاں ریاست رام پور کے رئیس اور معزز عہدہ دار تھے۔ آپ کی والدہ آبادی بانو بیگم (بی اماں) نواب درویش علی خاں پنجہزاری کی اولاد میں سے تھیں۔ جو شہنشاہ اکبر کے درباری تھے۔ بی اماں ایک روشن خیال۔ نیک طینت اور دیندار خاتون تھیں۔ اور ان کا دل وطنی و ملی درد سے بھرا ہوا تھا۔ وہ وطن اور ملت کی سچی بہی خواہ اور عہد سعادت کا ایک عمدہ نمونہ تھیں۔ انہوں نے ضعف و نقاہت کے باوجود وطن اور ملت کی خدمات مجاہدانہ اور سرفروشانہ جوش و خروش کے ساتھ انجام دیں اور یہ اسی ذات گرامی کی تعلیم و تربیت کا حقیقی اثر تھا۔ کہ مولانا محمد علی ہندوستان میں غیر معمولی ہر دلعزیزی اور یادگار زمانہ شہرت حاصل کر سکے۔

ہنوز انہوں نے اپنی زندگی کی دو بہاریں بھی نہ دیکھی تھیں۔ کہ باپ کا سایہ ہمیشہ کے لئے سر سے اُٹھ گیا۔ اس وقت بی اماں کی عمر ۲۷ سال کی تھی عقلمند ماں نے دلی محبت اور پیار سے تعلیم دی۔ اور بریلی اسکول میں داخل کر دیا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ۱۸۹۰ء میں علیگڈھ کالجیٹ اسکول کی ساتویں جماعت میں داخل ہوئے۔ جہاں ان کے دوسرے بھائی

ذو الفقار علی خاں اور شوکت علی خاں پڑھتے تھے۔ چار سال میں چاروں جماعتیں طے کر کے ۲۵ اپریل ۱۸۹۴ء کو انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ سکول کی تعلیم کے زمانہ میں وہ تعلیم میں یا کھیلوں اور ورزشوں میں نمایاں نہ تھے۔ لیکن طبیعت میں ذہانت بدرجہ موجود تھی۔ چار سال تک کالج میں تعلیم پاکر ۱۸۹۸ء میں بی۔ اے کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ آٹھ سال کی اس تعلیمی زندگی میں انہوں نے سینیر پرائز حاصل کرنے کے علاوہ کالج کے کسی شعبۂ حیات میں کوئی نمایاں حصہ نہ لیا۔ کون کہہ سکتا تھا۔ کہ ایک دن یہ عظیم الشان ہستی آسمانِ ہند پر مہر درخشاں بن کر چمکے گی۔ سول سروس (کلکٹری۔ کمشنری۔ ججی وغیرہ) کے امتحان کے بعد وہ ولایت چلے گئے۔ جہاں کی مشہور علمی درسگاہ اکسفورڈ یونیورسٹی سے ۱۹۰۲ء میں بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔ لیکن سول سروس کے امتحان میں ناکام رہے۔ الہ آباد ہائیکورٹ کے امتحان میں شریک ہوئے۔ مگر یہاں بھی کامیاب نہ ہوئے۔ آکسفورڈ میں بڑودہ کے رئیس کنور فتح سنگھ ان کے ہم سبق تھے اور مولانا سے ان کو خاص انس تھا۔ چنانچہ ان کی تحریک پر وہ ریاست بڑودہ میں محکمہ افیون کے افسر اعلےٰ مقرر ہوگئے۔ اور لوساری کی کمشنری پر تقرر ہوا۔ اسی زمانہ میں ولیعہد کے پرسنل اسسٹنٹ (میر منشی) مقرر ہوئے۔ اور کبھی عمر بھر رشوت، ہدیہ یا نذرانہ قبول نہ کیا۔ اسی زمانہ میں آپ نے بمبئی کے مشہور انگریزی اخبار ٹائمز آف انڈیا میں ایک سلسلہ مضامین شروع کیا۔ جس کی مدیر اخبار نے بہت تعریف کی۔ اور آئندہ کے لئے قلمی امداد کا وعدہ لیا۔ اسی عرصہ میں ریاست برودہ کی ملازمت سے مستعفی ہونے کے لئے دو سال کی رخصت لے کر کلکتہ چلے آئے۔

شاید بہت کم افرادِ ملک کو یہ معلوم ہوگا۔ کہ ۱۸۸۵ئہ میں جب انڈین نیشنل کانگرس کا پہلا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا تو اس وقت ہندوستان میں کسی قسم کا سیاسی جوش نہ تھا۔ حتیٰ کہ ۱۹۱۱ئہ میں مولانا محمد علی میدانِ سیاست میں نمودار ہوئے۔ اور ۱۴ر جنوری ۱۹۱۱ئہ کو انہوں نے ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار "کامریڈ" جاری کیا جس نے اتحاد اقوام کا نظریہ پیش کیا۔ وطنی اختلافات کی اہمیت کو کم کیا۔ اور خود مختاری کی اہمیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی۔ "کامریڈ" قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اس کے مضامین نہایت اعلےٰ اور ادبیانہ ہوا کرتے تھے۔ دسمبر ۱۹۱۲ئہ میں وہ کلکتہ سے دہلی چلے آئے۔ اور ۱۹۱۴ئہ میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ اور روزنامہ "ہمدرد" اردو میں جاری کیا۔ لیکن جنگ عظیم کے زمانہ میں وہ مئی ۱۹۱۵ئہ میں نظر بند کر دیئے گئے۔ ۷ر ستمبر ۱۹۱۷ئہ کو حکومت نے ایک عہد نامہ کا کاغذ پیش کر کے مطالبہ کیا۔ کہ وہ اس پر دستخط کر کے یہ عہد کریں۔ کہ وہ حکومت کے خلاف کسی ایسی تحریک میں حصہ نہیں لیں گے۔ جو امنِ عامہ کے لئے مضر ہو۔ انہوں نے جواب دیا۔ کہ وہ ہر عہد کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن ایسا ایک لفظ لکھنے کے لئے تیار نہیں۔ جو حکم خداوندی کی اطاعت سے باز رکھنے والا ہو آخر نظر بندی کے چار سال آٹھ ماہ بعد ۲۸ر دسمبر ۱۹۱۹ئہ کو شاہی اعلان کے مطابق رہا کر دیئے گئے۔ اور تحریک خلافت کے سلسلہ میں ایک وفد کے ہمراہ یوروپ روانہ ہوگئے۔ اکتوبر ۱۹۲۰ئہ کو یورپ سے واپس آئے۔ اور ملک کو ایک محاذ پر جمع ہو کر آزادی حاصل کرنے کی تلقین کی۔ اس کے بعد آپ پر کراچی کا تاریخی مقدمہ چلایا گیا۔ ۱۹۲۱ئہ کو وہ دو سال کے لئے محبوس کر دیئے گئے۔ اگست ۱۹۲۳ئہ کو

دوسال سزائے قید ختم کر کے رہا کر دیئے گئے۔ ۱۹۳۰ء میں وہ اخبار "کامریڈ" کے نمائندہ کی حیثیت سے اسمبلی کے اجلاس میں گئے۔ اور اوپر کی گیلری میں رونق افروز ہوئے۔ ارکان اسمبلی مرکزی ہال میں بیٹھے تھے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ نے کہا آخر آپ اسمبلی میں تشریف لائے ہیں۔ اگر آپ اس کے ممبر بن جائیں۔ تو ہمارے پاس بیٹھ سکتے ہیں۔ مرحوم حاضر جوابی میں ید طولےٰ رکھتے تھے۔ فوراً جواب دیا کہ میں بلندی پر سے ہی آپ کی پستی کا تماشا دیکھوں گا۔

۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ان کی سیاسی زندگی میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گذرا۔ جو انہوں نے نظر انداز کر دیا ہو۔ "کامریڈ" کا اجراء۔ "ہمدرد" کی ادارت۔ مسلم لیگ کا قیام۔ مسجد کانپور کا وفد لندن۔ امرت سر کانگرس میں قائدانہ شرکت۔ تحریک خلافت اور کانگرس وغیرہ تمام ادارے ان کے دائرۂ عمل میں شامل تھے اور ہر ادارہ ان کے نظریۂ آزادی کا ترجمان تھا۔

رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم ہندو مسلم اتحاد کے بھی ویسے ہی حامی تھے جیسا کہ وہ آزادیٔ وطن کے طالب تھے۔ انہوں نے ۱۹۰۴ء میں ہی یہ خیال ظاہر کر دیا تھا۔ کہ میں ۲۰ سال سے ایک ایسے متحدہ ہندوستان کا خواب دیکھ رہا ہوں۔ جو ریاستہائے متحدہ سے بھی زیادہ باعظمت، زیادہ شریفانہ اور زیادہ روحانی ہو۔ مرحوم یوں تو دائم المریض تھے۔ مگر پچیس سال سے ذیابیطس کا مرض اندر ہی اندر گھن کی طرح ان کی طاقتوں کو ڈکار رہا تھا۔ جولائی ۱۹۲۹ء میں وہ شملہ کے ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ اور دل اس قدر ضعیف ہو چکا تھا۔ کہ ایک منٹ زندہ رہنے کی امید نہیں تھی۔ مگر چند ماہ بیمار رہنے کے باوجود بھی وہ ۷ ہزار میل کے

سفر پر آمادہ ہو گئے۔ اور ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس کے رکن کی حیثیت سے ولایت چل دیئے۔ رفقاء نے روکا۔ احباب سدِ سکندری بنے۔ اور خود مولانا عبد الماجد بدایونی مرحوم نے ان سے بمبئی میں پوچھا۔ کہ تم دنیا بھر کی بیماریوں میں مبتلا ہو اس خطرناک حالت میں لندن کیوں جاتے ہو؟ مرحوم نے جواب دیا۔ کہ مرنے کے لئے جاتا ہوں۔ مرحوم نے گول میز کانفرنس میں برٹش امپائر کے روبرو صاف الفاظ میں کہہ دیا۔ کہ میں جس مقصد کے لئے یہاں آیا ہوں۔ وہ یہ ہے۔ کہ میں اپنے ملک کو اس حالت میں روانہ ہوں۔ کہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو۔ میں ایک غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا۔ بلکہ ایک غیر اور آزاد ملک میں اپنی موت کو ترجیح دوں گا۔ اگر آپ ہندوستان کے لئے آزادی نہیں دے سکتے تو پھر آپ کو میری قبر کے لئے گز بھر زمین دینی پڑے گی۔ اس حقیقی جذبۂ حُبِ وطن اور ملت کے باعث یورپ کے سیاست دان یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔ کہ محمد علی کا دل نپولین کا دل ہے۔ محمد علی کی زبان برک کی زبان ہے۔ اور محمد علی کا قلم میکالے کا قلم ہے۔ اور وہ عالمِ انسانیت کا زبردست پیشوا ہے"۔ انہوں نے اپنے قول کو پورا کر دکھایا۔ اور ۴ رجنوری ۱۹۳۱ء کو ۱/۲ ۹ بجے صبح اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کو رحلت کر گئے۔ ۹ رجنوری کو ان کی نعش نمازِ جمعہ کے بعد لندن بندرگاہ بلٹری کو روانہ ہوئی۔ جہاز نازکنڈہ کا ایک کمرہ تابوت کے لئے وقف تھا۔

گول میز کانفرنس کے تمام مسلمان ارکان، وزیرِ اعظم۔ وزیرِ ہند اور رؤسائے سلطنت اس شہید قوم کے آخری دیدار کے لئے بندرگاہ پر موجود تھے۔ حکومت برطانیہ نے تابوت کو مرحوم کی آخری آرامگاہ بیت المقدس تک پہنچانے کے لئے کافی بڑھکر

سہولتیں بہم پہنچائیں ۔

۱۳ر جنوری ۱۹۳۱ء کو جہاز مارسیلز۔ ۱۵ر جنوری کو مالٹا اور ۲۰ر جنوری کو بندر سعید پہنچا۔ جہاں مصری حکومت کا کافی انتظام تھا۔ رات کو میت مسجد عباس میں پہنچائی گئی۔ ساحل سے مسجد تک ہزارہا انسانی ہستیوں نے نعش کو کاندھا دیا۔ اور ۲۳ر جنوری ۱۹۳۱ء کو جامع مسجد سیدنا عمرؓ کے مغربی ایوان کے شمالی حجرہ میں اس بطل حریت، قائد اسلام اور شہید ملت و وطن کی قبر بنائی گئی۔ اور اسلام کے اس محبوب ترین فرزند کو ہمیشہ کے لئے آغوش لحد کے سپرد کر دیا گیا ۔

ڈاکٹر انصاری

ڈاکٹر انصاری ۱۸۸۰ء میں یوسف پور میں پیدا ہوئے - ان کا اصلی نام مختار احمد تھا - اور حضرت ایوب انصاری کی اولاد سے منسوب ہونے کے باعث انصاری کہلاتے تھے - جب وہ پیدا ہوئے تو ان کا خاندان عُسرت کی زندگی بسر کرتا تھا - ان کی طبیعت میں بچپن سے ہی رفعت و عروج کے آثار پائے جاتے تھے - ۱۸۸۵ء میں انہوں نے وطنی درسگاہ چھوڑ دی - اور ۱۹۰۰ء میں بی - اے کی کامیاب ڈگری حاصل کی - اس کے بعد وہ انگلستان چلے گئے - اور ایڈنبرا کالج میں ڈاکٹری کی اعلےٰ تعلیم حاصل کی - جہاں اپنی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے تعلیمی وظایف حاصل کرتے رہے - جن سے اپنے عزیز و اقارب کی درپردہ تعلیمی امداد و اعانت کرتے رہے - اور ان کے فیض معنوی کا یہ جذبہ شبانہ روز ترقی پذیر رہا - ۱۹۱۰ء میں فتحپوری مسجد دہلی کے قریب انہوں نے اپنا مطب جاری کیا - اور ان کی غیر معمولی طبی قابلیت کے ساتھ ان کی مہمان نوازی بھی شہرتِ دوام حاصل کرتی رہی +

۱۹۱۲ء میں اٹلی اور ٹرکی کے درمیان جنگ طرابلس شروع ہوئی - اور ترکوں کو اس لڑائی میں انتہائی طور پر مصروف ہونا پڑا - ڈاکٹر صاحب کے جذبہ ملی میں جوش پیدا ہوا - اور انہوں نے اپنے ترک بھائیوں کی تکالیف کا

پورا احساس کیا۔ اور مطب چھوڑ دیا۔ اور درد مند مسلمانوں کی ایک جماعت کو اپنے ساتھ شریک کر کے مصمم ارادہ کرلیا۔ کہ وہ ٹرکی میں جاکر ترکوں کی امداد کریں۔ اور زخمیوں کی مرہم پٹی کریں۔ چنانچہ انہوں نے اپنا تمام اثاث البیت فروخت کر دیا۔ اور ترکی بھائیوں کی مرہم پٹی کے لئے روانہ ہوگئے۔ اور منزل مقصود پر پہنچ کر انہوں نے ترکوں کی یادگار خدمات انجام دیں۔ کہا جاتا ہے۔ کہ جب وہ ٹرکی سے ہندوستان واپس آئے۔ تو بالکل خالی ہاتھ اور خالی جیب تھے۔ انہوں نے دوبارہ مطب جاری کر دیا۔ لیکن ابھی کلی اطمینان حاصل نہ ہُوا تھا۔ کہ سنہ ۱۹۱۹ء میں خلافت اسلامیہ کا جھگڑا شروع ہو گیا۔ اور انہوں نے قوم کے لئے اپنا تمام مال و جان قربان کر دیا۔ اور جب سنہ ۱۹۲۰ء میں وہ خلافت کا ایک وفد لے کر انگلستان گئے۔ تو ان کو اخراجات سفر کے لئے اپنی موٹر کار فروخت کرنا پڑی۔ واپسی پر ہندوستان معرکہ کارزار بنا ہُوا تھا۔ اور زور و شور سے ہل چل مچی ہوئی تھی۔ یہاں بھی ان کو آرام و اطمینان نصیب نہ ہوا۔ اور انہوں نے شبانہ روز خدمت ملی کے لئے وقف کر دیئے۔ اگرچہ سنہ ۱۹۲۲ء میں ملک کے اندر کسی حد تک سکون پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفریق و تشتت کی چنگاریاں مشتعل ہو چکی تھیں۔ اور وطنی فضا مکدّر ہو رہی تھی۔ انہوں نے دونوں قوموں کے تعلقات خوشگوار بنانے کی انتہائی کوشش کی۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں انہوں نے آل انڈیا کانگرس کے اجلاس منعقدہ مدراس کی صدارت قبول کی۔ اور آپ کی صدارت میں اولین مرتبہ

یہ فیصلہ ہوا۔ کہ ہندوستان کو مکمل آزادی حاصل ہونی چاہیئے۔ مگر افسوس۔ ان کی موت کے بعد ان کی وطنی قربانیوں کی کوئی قدر نہ کی گئی۔ وہی کانگرس آج ہندوستان میں ہندو راج قایم کرنے پر آمادہ ہے۔ اور مزدوروں کی حمایت کی آڑ سے کر سرمایہ داروں کا حوصلہ بڑھا رہی ہے ؛

ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی کے آخری ایام ہندوستان کی سب سے بڑی قومی درسگاہ جامعہ ملیہ دہلی کی خدمت میں گزارے۔ اور ملک کے امراء۔ رؤسا۔ راجاؤں اور نوابوں کو جامعہ ملیہ کی امداد و اعانت پر آمادہ کیا۔ یہ انہی کی سعیٔ حسنہ کا نتیجہ ہے۔ کہ آج جامعہ ملیہ میں ایسی مایۂ ناز ہستیاں موجود ہیں۔ جو اس کی ترقی کے لئے ایثار و قربانی سے سرِ مُو دریغ نہیں کرتیں ؛

وہ حد درجہ خلیق۔ ملنسار۔ متواضع۔ بامروّت اور ہمدرد انسان تھے اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ وہ چند سال کے اندر اندر دنیا کی دولت سے مالامال ہو سکتے تھے۔ مگر ان کی زندگی کا ہر لمحہ دوسرے لوگوں کی امداد و اعانت میں گذرا۔ اور اس غیرت مند ہستی نے اپنی ذات کے لئے کبھی دست سوال دراز نہ کیا۔ وہ ۹ مئی ۱۹۳۲ء کی رات کو رام پور سے واپس آرہے تھے جبکہ بجنور کے قریب ان کو درد سینہ اُٹھا۔ جو ان کی موت کا آخری پیغام ثابت ہُوا۔ اور چند لمحوں کے اندر اندر ان کو اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف لے گیا اور ہندوستان کی یہ عظیم الشان اور مایۂ ناز ہستی ہماری آنکھوں سے ہمیشہ کیلئے اوجھل ہوگئی ؛

پنڈت برج نرائن چکبست

پنڈت صاحب ۱۸۸۲ء میں فیض آباد (اودھ) میں پیدا ہوئے، ان کے والد نے ان کی تعلیم کے لئے لکھنؤ کا انتخاب کیا۔ میٹرک کے بعد ۱۹۰۵ء میں کننگ کالج سے بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد قانونی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اس کو مکمل کر کے وکالت شروع کر دی ؛

شعر گوئی کا ذوق ان کو سولہ سترہ سال سے ہی پیدا ہو گیا تھا۔ جو رفتہ رفتہ عمر کے ساتھ ہی ترقی کرتا چلا گیا۔ انہوں نے غزل گوئی کی طرف بہت کم توجہ دی۔ مگر قومی اور منظری نظموں سے انہیں انتہائی محبت اور شغف تھا۔ ان کی اکثر ملّی و وطنی نظمیں منظر عام پر آ کر قبولیت حاصل کر چکی ہیں ؛

فروری ۱۹۲۶ء کو وہ ایک مقدمہ کی پیروی کرنے کے لئے رائے بریلی گئے ہوئے تھے۔ جبکہ یکایک فالج کا حملہ ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی زبان بھی بند ہو گئی۔ اور شام کے سات بجے بریلی کے سٹیشن پر ہی انتقال کیا ان کی لاش لکھنؤ میں لائی گئی۔ اور وہیں پر ان کے اعزاء و اقرباء نے ان کی آخری رسوم ادا کیں ؛

"صبح وطن" ان کی نظموں کا دلکش مجموعہ ہے۔ جو شائع ہو کر منظر عام پر

پر آچکا ہے ۔ اپنی موت سے چند سال پہلے انہوں نے ایک ماہوار رسالہ "صبح امید" کے نام سے جاری کیا تھا ۔ وہ زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا اور عامۃ الناس کی ناقدری کا شکار ہو کر بند ہو گیا ۔ ایک ڈرامہ "کملا" بھی ان کی یادگار ہے ٭

پنڈت رتن ناتھ سرشار

پنڈت رتن ناتھ سرشار ایک مؤقر و معزز کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ۱۸۴۷ئہ میں سرزمین لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابھی عمر کی ابتدائی چار بہاریں بھی نہ دیکھی تھیں۔ کہ باپ کا سایۂ عاطفت سر سے اُٹھ گیا۔ وہ انگریزی۔ عربی۔ اور فارسی تینوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ انگریزی زبان انہوں نے لکھنؤ کے کنگ کالج میں حاصل کی تھی۔ لیکن یہاں پر انہوں نے کوئی ڈگری حاصل نہیں کی تعلیم سے فارغ ہو کر وہ پہلے پہل ضلع اسکول کھیری میں مدرس مقرر ہوئے۔ اس زمانہ میں پنڈتوں کا ایک ماہوار رسالہ "مراسلہ کشمیری" شائع ہوا کرتا تھا۔ اس میں اپنے مضامین بھیجا کرتے تھے "اودھ پنچ" لکھنؤ میں بھی ان کے مضامین چھپتے تھے۔ گو یہ مضامین اس زمانہ میں کوئی خصوصیت نہ رکھتے تھے۔ مگر ان کی آئندہ تصنیفات اور صحیفہ نگاری کا سنگ بنیاد ضرور تھے۔ انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کی بڑی مہارت رکھتے تھے۔ اور اپنے ترجمہ شدہ مضامین سررشتہ تعلیم کے اکثر رسالوں میں بھیجا کرتے تھے۔ جو قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ ڈائرکٹر محکمہ تعلیمات ان کے مضامین کو نہ صرف قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ بلکہ ان کی لیاقت اور قابلیت کی داد دیا کرتے تھے۔ "مرآۃ الہند"

اور "ریاض الاخبار" کے اوراق بھی ان کے مضامین سے مزین ہوا کرتے تھے۔
۱۸۷۸ء میں انہوں نے ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ "شمس الضحیٰ" کے نام
سے شایع کیا۔ جس میں سائنس کی اکثر اصطلاحات کو نہایت سلیس اور عام فہم
اردو میں بیان کیا۔ اسی سال سررشتۂ تعلیم کے ڈائرکٹر ڈاکٹر گریفتہ نے
منشی نولکشور مالک "اودھ اخبار" سے ان کا تعارف کرایا۔ اور "اودھ اخبار"
کے صیغۂ ادارت میں شریک ہو گئے۔ اپنے مشہور ناول "فسانہ آزاد" کا سلسلہ
انہوں نے پہلے پہل اسی اخبار میں شروع کیا تھا۔ جو ۱۸۷۹ء تک قایم رہا۔
۱۸۸۰ء میں "فسانہ آزاد" ایک مستقل کتاب کی شکل میں شایع ہوا۔ وہ الہ آباد
ہائیکورٹ میں مترجم کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ مگر چونکہ دفتر کے
قواعد سخت واقع ہوئے تھے۔ اسلئے ان قواعد کے متحمل نہ ہو کر وہ ہائیکورٹ
سے مستعفی ہو گئے۔ ۱۸۹۵ء میں وہ حیدرآباد دکن میں چلے گئے۔ جہاں مہاراجہ
سرکشن پرشاد مدارالمہام ریاست نے اپنا منظوم و منثور کلام اصلاح کی غرض
سے ان کے سپرد کیا۔ اور دو صد روپیہ ماہوار مشاہرہ مقرر کر دیا۔ وہ "دبدبۂ آصفیہ"
حیدرآباد کے صیغہ ادارت میں بھی کچھ عرصہ تک کام کرتے رہے۔ ۱۹۰۲ء
میں حیدرآباد میں ہی راہئ ملک عدم ہوئے۔

سرشار ایک قابل شاعر بھی تھے۔ مگر ان کی شہرت کا زیادہ تر مدار
ان کی نثر کی کتابوں پر ہے۔ جن میں ان کا مقبول اور مشہور و معروف ناول
"فسانہ آزاد" خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی نثر میں انتہائی روانی اور
دلچسپی ہے۔ جس میں ہلکی ہلکی ظرافت اپنی رنگینی و رعنائی کی بہار دکھا رہی ہے۔

مگر اس میں شک وشبہ کی گنجایش نہیں۔ کہ ان کی کتابوں میں عام طور پر بے ربطی اور عدم تسلسل پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ان کی تحریروں میں برجستگی تو پائی جاتی تھی۔ مگر وہ ان تحریروں پر نظر ثانی نہیں کیا کرتے تھے ؛

نواب محسن الملک سید مہدی علی ۹ر دسمبر ۱۹۳۷ء کو اٹاوہ میں پیدا ہوئے۔
ان کے باپ میر ضامن علی اٹاوہ کے مشہور سید خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔
والدہ کی طرف سے وہ شیخوپورہ ضلع فرخ آباد کے عباسی خاندان کے چشم و چراغ
تھے۔ انہوں نے فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم اپنے گھر میں حاصل کی۔
پھر مولینا عنایت حسین کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ جو اٹاوہ کے قریب
پھاپھنڈی میں قیام رکھتے تھے۔

حصولِ تعلیم کے بعد انہیں روٹی کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اور ایسٹ انڈیا
کمپنی کے ماتحت دس روپیہ ماہوار کے کلرک ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء میں اہل مد
بنائے گئے۔ یہاں یہ ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ غدر کے مصیبتناک
زمانہ میں وہ اور ان کا خاندان حکومت برطانیہ کا پورے طور پر وفادار رہا۔ غدر
کے بعد وہ سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ ۱۸۶۱ء میں اٹاوہ کے تحصیلدار ہوئے
دو سال کے بعد بہت سے یورپین امیدواروں کے ساتھ ڈپٹی کلکٹر کے
امتحان میں شریک ہوئے۔ اور اول درجہ میں پاس ہوئے۔ ۱۸۶۷ء میں
وہ مرزا پور کے مستقل ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ اس دوران میں وہ ڈھوڈی اور رائے بریلی
کے سپرنٹنڈنٹ بھی رہے۔ پھر ریاست حیدر آباد میں تبدیل ہو کر چلے گئے۔ اس وقت

سر سالار جنگ بہادر حیدر آباد کے وزیر اعظم تھے۔ جنہوں نے شمالی ہند کی قابل قدر ہستیوں کو حیدر آباد میں جمع کر لیا تھا۔ جن میں نواب محسن الملک۔ مشتاق حسین اور گرامی برادران خصوصیت سے قابل ذکر تھے۔ نواب محسن الملک ۱۸۷۴ء میں حیدر آباد پہنچے۔ اور ابتدا میں ریونیو انسپکٹر جنرل بنائے گئے۔ پھر سروے ڈیپارٹمنٹ کے کمشنر ہو گئے ؀

نواب مرحوم پہلے شخص تھے۔ جنہوں نے حیدر آباد میں فارسی کی بجائے اُردو کو عدالتی زبان قرار دیا۔ دو سال کے بعد سر سالار جنگ بہادر نے ان کو اپنا ریونیو سکرٹری بنا لیا۔ ۱۸۸۴ء میں وہ ۲۴۰۰ روپے ماہوار مشاہرہ پر مالی اور سیاسی سکرٹری بنائے گئے۔ ان خدمات کے صلہ میں ان کو منیر نواز جنگ محسن الدولہ محسن الملک" کا خطاب عطا ہوا۔ اور وہ اپنے اصلی نام کے بجائے محسن الملک کے نام سے مشہور ہو گئے ؀

لندن میں سر ولیر جنگ بہادر کے مقدمہ میں ان کو ایک سپشل کمیٹی کے سامنے پیش ہونے کا موقع ہوا۔ اور انہوں نے ایسی ہوشیاری اور توجہ سے اس کام کو انجام دیا۔ کہ انہوں نے ہز ہائنیس نواب دکن کے دل میں جگہ کر لی۔ اور اپنے ادائے فرض کے دوران میں وہاں کے بڑے بڑے انگریزوں سے ملاقات کی۔ مسٹر گلیڈسٹون ان سے مل کر اس قدر محظوظ ہوئے۔ کہ انہوں نے زندگی بھر ان سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا ؀

انگلستان سے واپس آکر وہ ۱۸۹۳ء تک اپنے فرض منصبی کو انجام دیتے رہے۔ اور آخر کار ان حالات کے ماتحت حیدر آباد کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے جو

عموماً ایسی ریاستوں میں لوگوں کے لئے مقدر ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ریاست
نے ایک قابل ترین افسر کو ہاتھ سے کھو دیا۔ لیکن مسلمانوں کو ان کی ذات سے
بہت فائدہ ہوا۔ وہ ۸۰۰ روپیہ ماہوار پنشن پر علیگڈھ میں آ گئے۔ اور اپنا سارا
وقت مسلمانوں کی آئندہ ترقیات کے لئے وقف کر دیا۔ سرسید مرحوم کی ان
تمام سکیموں میں ممکن امداد دیتے رہے۔ جو ایک پسماندہ قوم کیلئے زیر غور تھیں۔
سرسید مرحوم کے مشن میں شریک ہونے اور اس وقت کا صحیح خاکہ کھینچنے
کے لئے ۱۸۶۳ء کی طرف واپس آنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جبکہ سرسید احمد
مرحوم نے انجیل پر اپنا تبصرہ شایع کیا۔ جس نے اسلامی حلقہ میں غضب ناک
نکتہ چینی کی لہر دوڑا دی۔ نواب محسن الملک نے سرسید مرحوم کو ایک چٹھی
لکھی۔ جس میں ان کو ایسے مدبرانہ طریق سے ڈانٹا گیا۔ کہ ان کے خیالات
یک قلم تبدیل ہو گئے۔ اور نواب محسن الملک کو نمایاں فتح ہوئی۔ اور چند ہی
ملاقاتوں میں ان دو فدا کاران اسلام کے درمیان ایسی گہری دوستی کا رشتہ
قایم ہو گیا۔ جو ان کی زندگی تک وابستہ رہا۔ وہ سرسید کے زبردست شریک کار
ہو گئے۔ اور انہوں نے تہذیب الاخلاق کے ایک افتتاحیہ میں لکھا:۔
"مولوی سید مہدی علی کی تعلیم، ذاتی قابلیت، مدبرانہ گفتگو اور
لسانی ایسی باتیں ہیں۔ جو مسلمانوں کی قلبی بصارت کو زائل نہیں کر سکتیں
بلکہ فخر کرنے کے لایق ہیں"۔

انہوں نے سرسید مرحوم کی تمام مشکلات میں حصہ لیا۔ جو ان کے کام
میں پیش آتی رہیں۔ اور اس کام میں انہوں نے سرسید مرحوم کی مالی امداد بھی

دریغ نہ کیا۔ بلکہ علیگڈھ کالج کے لئے حیدرآباد سے قابل یادگار وظیفہ مقرر کرادیا جس کے لئے مولانا حالی مرحوم نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انکو ایک مسرت آفرین مکتوب لکھا ؂

۱۸۷۰ء میں سرسید مرحوم نے تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ تاکہ مسلمانوں کی اخلاق اصلاح کی جائے۔ اسلام کو اپنے اصلی رنگ میں ظاہر کیا جائے۔ اور بین الاقوامی تفریق کو مٹایا جائے۔ تہذیب الاخلاق اردو ادب کی تاریخ میں ایک نمایاں یادگار رہے گا۔ سرسید مرحوم نے اس مشکل کام میں نواب محسن الملک سے پوری امداد لی۔ اخبار میں ان کے جو مضامین چھپتے تھے۔ ان میں مذہب اور تاریخ کو پورا دخل ہوتا تھا۔ مولینا حالی نے ان کی تحریروں کے متعلق ایک دفعہ لکھا :۔

"محسن الملک نے واقعات کہن کی یاد دلا کر مسلمانوں کو مسحور کیا۔ انہوں نے سرسید کی امداد کرتے ہوئے جو کچھ لکھا۔ بزرگان سلف کے کارنامے یاد دلا کر لکھا"۔

مولینا شبلی کی رائے ہے "وہ ایک مشہور و معروف انشاپرداز تھے۔ اور ان کی طرز تحریر مقبول عام تھی" ؂

ان کی تصانیف میں صرف "آیات بینات" ایک کتاب ہے۔ جو انہوں نے اسلامی رنگ میں لکھی۔ ویسے انہوں نے متعدد کتابوں کے ترجمے دوسری زبانوں سے اردو زبان میں کئے۔ جن میں "معرکۂ مذہب و سائنس" ایک بہترین اردو ترجمہ ہے۔ جو مولوی ظفر علی خاں مدیر "زمیندار" نے بھی کیا ؂

۱۸۹۳ء میں وہ مستقل طور پر علیگڈھ میں آ گئے۔ اور انہوں نے تمام بین الاقوامی تحریکات میں پرجوش حصہ لیا۔ اور اخبار تہذیب الاخلاق کے بجائے

"علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں ایک نئی رُوح پھونکی۔ اور کالج کے طلبہ سے آزادانہ مل کر اس کی ہیئت ترکیبی کو درست کرنے کی کوشش کی۔ کالج کی ڈیبٹنگ سوسائٹی میں وہ خصوصیت سے حصہ لیتے تھے۔ لیکن ان کا حقیقی مطمع نظر یہ تھا۔ کہ علیگڈھ کالج کی تحریک کو حیات بخش طریقہ سے چلایا جائے۔ جس کے لئے انہوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو انتخاب کیا۔ اور ۱۸۹۰ء میں پانچویں سالانہ کانفرنس کے موقعہ پر ایک ہنگامہ خیز تقریر کی۔ جس میں سرسید مرحوم نے ان کو فارسی نظم میں ہدیۂ تبریک پیش کیا۔ اور وہ کانفرنس کے دوبارہ صدر مقرر کئے گئے۔

سرسید کے انتقال کے بعد انہوں نے کانفرنس کو از سر نو زندہ کیا۔ جو اپنے بانی کے ساتھ آخری سانس لے رہی تھی۔ اور کلکتہ۔ مدراس اور بمبئی کے دور دراز مقامات پر اس کے سالانہ اجلاس منعقد کئے۔ سرسید علماء اسلام سے شرکت کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ مگر انہوں نے اس کام میں علماء کی امداد ضروری سمجھی۔ اور ۱۹۰۴ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک اجلاس لکھنؤ میں طلب کیا۔ جس کے صدر سر تھیوڈر مارسین پرنسپل ایم۔ اے۔ او۔ کالج علیگڈھ تھے۔ اس کانفرنس میں شیعہ اور سُنّی دونو جماعتوں کے علماء مدعو کئے گئے۔ انہوں نے علماء کے سامنے ساری حقیقت بیان کر دی۔ اور مغربی تعلیم کے لئے ان کی اعانت طلب کی۔ جس میں اکثر نے ان کی غلط روی پر الزام لگایا۔ اور اکثر نے اپنی ضد کو چھوڑ دیا ٭

۱۸۹۷ء میں سرسید کے انتقال نے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اور اب مسلمانوں کی نظر انتخاب نواب محسن الملک پر پڑی۔ اور کالج کے

ٹرسٹیوں نے ان کو اپنا آنریری سکرٹری بنا لیا۔ انہوں نے اپنے پیشرو کے کاموں کو نہ صرف سنبھالا۔ بلکہ ان کو شاندار ترقی دی ؛

کالج کی تاریخ میں یہ نہایت نازک وقت تھا۔ جبکہ دفتر کا ایک منیجر سرسید کے آخری ایام حیات میں ایک لاکھ سے زائد روپیہ کا غبن کر کے بھاگ گیا تھا اس وقت کالج کی مالی حالت بہت گر چکی تھی۔ اور ٹرسٹیوں میں افسوسناک اختلاف رائے پیدا ہو گیا تھا۔ اور کالج تباہی کی قریبی منزلوں پر پہنچ چکا تھا۔ نواب محسن الملک نے ہز ہائنیس سر آغا خاں۔ سر آدم جی پیر بھائی اور معزز عوام کی امداد سے کالج کی حالت کو درست کیا۔ ۱۸۹۸ء میں طلبہ کی مجموعی تعداد ۳۴۳ تھی۔ اور کالج کی سالانہ آمدنی ۷۴۷۶۷ روپے ۵ آنے ۴ پائی تھی مگر ۱۹۰۷ء میں ان کی موت کے وقت طلبہ کی تعداد ۸۰۰ اور سالانہ آمدنی ۱۵۳۶۵۵ روپے تھی۔ یہ اعداد و شمار کسی تبصرہ کے محتاج نہیں ہیں۔ ہز رائل ہائی نس پرنس آف ویلز اور ہز میجسٹی افغانستان کی تشریف آوری کے باعث کالج اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا — انہوں نے اپنے آپ کو سرسید کا صحیح جانشین ثابت کیا۔ اور کالج کو آکسفورڈ اور کیمبرج کی طرز پر یونیورسٹی بنا دینے کا جذبہ اپنے دل میں پیدا کیا۔ اگرچہ اس خواب کی تعبیر ان کے حسب مراد نہ ہوئی۔ لیکن انہوں نے اپنا کام پوری جانفشانی سے کیا۔ اور عامۃ الناس کی مدد سے اس کو یونیورسٹی بنا دیا۔ اگرچہ وہ کیمبرج اور آکسفورڈ کے مقابلہ کی یونیورسٹی نہیں۔ مگر اس میں شک نہیں۔ کہ ان کا نام دنیائے اسلام میں ابد الآباد تک زندہ رہے گا ؛

انہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے علاوہ سیاسیات میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ سر سید کی موت کے بعد اردو ہندی کا سوال پیدا ہوا۔ جو مقامی حکومت کے ایک ریزولیوشن کے ذریعہ نازک صورت اختیار کر گیا۔ جس سے اردو کے ملیا میٹ ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ انہوں نے لکھنؤ میں ایک نمائندہ اجلاس منعقد کیا جس میں مقامی حکومت کے اس رویہ کے خلاف زبردست احتجاج کیا گیا۔ انہوں نے صدر کی حیثیت سے ایک پرجوش تقریر کی۔ اور مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ کو پورے طور پر واضح کر دیا ؛

سر انٹونی میکڈونل لفٹنٹ گورنر صوبجات متوسط آگرہ و اودھ نے ان کارروائیوں میں ان کی شرکت کو بنظر استحسان نہ دیکھا۔ اور اس کا اثر کالج پر بہت برا پڑا۔ اس پر انہوں نے کالج کے آنریری سکرٹری کے عہدہ سے مستعفی ہونے کی کوشش کی۔ تاکہ کالج کو کسی طرح نقصان نہ پہنچے۔ مگر حکومت کی باگ ڈور سر جیمس لاٹاؤچ کے ہاتھوں میں آگئی۔ اور حالات اعتدال پر آگئے ؛

سنہ ۱۹۰۶ء میں انہوں نے ایک آل انڈیا محمڈن ڈیپوٹیشن مرتب کیا جس کے صدر ہز ہائینس سر آغا خاں تھے۔ یہ ڈیپوٹیشن ہز اکسیلینسی لارڈ منٹو کے پاس پہنچا اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ حکومت نے مسلمانوں کا مطالبہ منظور کر لیا۔ اور مسلمانوں کے اندر ایک نئی بیداری پیدا ہو گئی۔ بعد ازاں ایک آل انڈیا مسلم لیگ قائم کی گئی جس کی ترتیب میں انہوں نے قیمتی امداد دی ؛

ہندو مسلم مسئلہ کے متعلق ان کے قابل قدر خیالات کی اب تک قدر کی جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی رہے۔ انہوں نے

ہندوستان کی آزادی کو دونوں قوموں کے اتحاد و اتفاق پر محمول کیا۔ تعلیمی کانفرنس منعقدہ مدراس کے موقع پر انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ کہ "جب تک ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کی کشش نہیں ہے۔ اور جب تک وہ دوستدارانہ تعلقات پیدا نہیں کریں گے کبھی پیکر آزادی سے ہم آغوش نہیں ہونگے" ایک دوسرے موقع پر انہوں نے کہا۔ "یہاں ہندو مسلم اشتراک کا سوال نہیں ہے۔ اس میں عیسائی بھی شریک ہیں۔ جب تک تینوں ایک پلیٹ فارم پر نہیں آئیں گے۔ ہندوستان کبھی آزادی کا خواب نہیں دیکھے گا"۔

انہیں اپنے آخری ایام میں کالج کے ایک نئے پرنسپل کی وجہ سے طلبہ کی ہڑتال کا افسوسناک نظارہ دیکھنا پڑا۔ زیادتی کام کی وجہ سے ان کی صحت خراب ہوگئی۔ اور جب آخری بار وہ بیمار ہوئے۔ اس وقت شملہ میں ریفارم سکیم کے متعلق وائسرائے سے پرائیویٹ ملاقات کر رہے تھے۔ وائسرائے نے اپنا خاص ڈاکٹر ان کے علاج کے لئے مقرر کر دیا۔ مگر علامات مرض نے خوفناک صورت اختیار کر لی۔ اور صحت کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اپنی موت سے دو یوم پہلے انہوں نے بیان کیا۔ کہ "میں نے اپنی قوم اور اپنے ملک کے لئے جو کچھ کیا۔ وہ دلی توجہ سے کیا۔ اگر میں نے کوئی غلطی کی ہو۔ تو مجھے اس کے لئے مجرم قرار نہ دیا جائے۔ میرے جذبات پاکیزہ تھے۔ اور خدا ان کو بہتر جانتا ہے"۔

۲۶ راکتوبر ۱۹۰۷ء کو انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور اپنی قوم کو

اپنے غم میں سوگوار رہنے کے لئے چھوڑ گئے۔ علیگڈھ کالج کے ٹرسٹیوں نے ان کے پسماندگان سے درخواست کی۔ کہ مرحوم کو اٹاوہ کے بجائے علیگڈھ میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ کالج کی مسجد کے احاطہ میں سرسید کے پہلو بہ پہلو ان کو دفن کر دیا گیا ؛

حکیم اجمل خاں

حکیم اجمل خاں کے جد امجد کاشغر کے رہنے والے تھے۔ جو سنٹرل ایشیا میں ترکستان کا ایک مشہور شہر ہے۔ وہ بابر کے عہد حکومت میں ہندوستان میں وارد ہوئے۔ اور دربار شاہی کے خاص مصاحبین میں شامل ہو گئے۔ ان میں خواجہ ہاشم اور خواجہ قاسم دو بھائی حیدر آباد سندھ میں رہتے تھے۔ اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ یہ دونوں خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ اور سندھ کے بہت سے ہندو مسلمان ان کے دامن عقیدت سے وابستہ تھے۔

ان کے خاندان نے ہندوستان میں وارد ہو کر طبابت کا پیشہ اختیار کیا اور طب یونانی کی بنیاد ڈالی۔ جس سے ہندوستان اور ایشیائے وسطیٰ میں دور و نزدیک ان کی شہرت ہو گئی۔ ان کے دادا حکیم شریف خاں نے یونانی طبابت کو اوج کمال پر پہنچایا۔ اور اپنی موت سے پہلے مختلف طبی موضوعات پر بے شمار کتابیں تصنیف کیں۔ وہ اپنے وقت کے مایۂ ناز طبیب تھے اور ان کی رائے اٹل ہوا کرتی تھی۔ ان کا زمانہ محمد شاہ کی حکومت سے وابستہ تھا۔ وہ مغلیہ حکومت کے عہد میں دہلی آ گئے تھے۔ یہاں ان کو تین بار جاگیریں ملیں۔ جو ۱۸۵۷ء میں حکومت برطانیہ نے ضبط کر لیں۔

حکیم محمود خاں حکیم اجمل خاں کے باپ تھے۔ جنھوں نے ۷۰ سال کی

عمر میں انتقال کیا۔ حکیم شریف خاں نے دہلی اور شمالی ہند میں اپنی طبابت کو نمایاں شہرت دی۔ لوگ دور و نزدیک سے ان کے پاس آتے تھے۔ اور ان کے کمالات طبی سے استفادہ کرتے تھے۔ موجودہ طبیہ کالج دہلی ان کی زندہ جاوید یادگار ہے ؎

حکیم محمود خاں کے بڑے صاحبزادے حکیم عبدالمجید خاں تھے۔ جو علم طب میں مایہ ناز کمالات کے حامل تھے اور ان کی بدولت آج طبیہ سکول کے تعلیم یافتہ طلبہ ہندوستان کے ہر ایک حصہ اور ایشیا کے اکثر حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ حکیم عبدالمجید خاں ۴۳ سال کی عمر میں فوت ہو گئے۔ اور ان کے چھوٹے بھائی حکیم واصل خاں ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ جنہوں نے مرحوم کے کام کو نہایت قابلیت سے سنبھالا۔ اور طبیہ سکول کو شایانِ شان طریق سے جاری رکھا۔ مگر ۳۴ سال کی عمر میں انہوں نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور خاندانی طبابت کا سارا بوجھ حکیم اجمل خاں کے کندھوں پر ڈال دیا گیا ؎

حکیم اجمل خاں ۱۷ شوال ۱۲۸۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اور اپنی شباب پرور زندگی میں دہلی کے کامیاب اطبا میں شمار ہونے لگے۔ اور ان کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پہ جلوہ آرا ہو گیا۔ ان کے شفاخانہ میں ہندو مسلم کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ ہر مذہب اور ہر فرقہ کے لوگ وہاں آتے تھے۔ اور بلا امتیاز قومیت ان کا علاج کیا جاتا تھا ؎

انہوں نے ابتدائے شباب ہی میں ہر قسم کی اسلامی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ علم ادب مختلف اساتذہ سے حاصل کیا۔ جن میں فارسی۔ عربی گرامر۔

تعلیم قرآن ۔علم منطق ۔علم سائنس ۔علم ادب ۔علم ہیئت ۔علم حساب اور علم حدیث شامل تھے ۔ علم ادب انہوں نے اپنے باپ سے حاصل کیا اور علم الادویہ کا زیادہ تر حصہ اپنے بھائی حکیم عبدالمجید خاں سے حاصل کیا ۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ۔ کہ طبیہ سکول کی شہرت جوان کے زمانہ میں ہوئی ۔ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی ؞

۱۹۰۴ء میں انہوں نے عراق عرب کا سفر کیا ۔ یہ ان کا پہلا سفر تھا ۔ جس میں انہوں نے بصرہ ۔ قط العمارہ ۔ بغداد ۔ کوفہ ۔ نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ کی زیارت کی ۔ وہاں کی لائبریریوں کا معائنہ کیا ۔ اور وہاں کے ہر ایک سائنسدان اور ڈاکٹر سے ملاقات کی ۔ ان کا یہ سفر تین ماہ تک جاری رہا ۔ وہ ان مدارس میں خصوصیت سے دلچسپی لیتے رہے ۔ جہاں بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی ۔ یہاں انہوں نے بہت سی معلومات حاصل کیں ؞

مئی ۱۹۰۴ء میں وہ دہلی میں واپس آ گئے ۔ ۱۹۱۱ء میں انہوں نے یورپ کی سیاحت کی ۔ اور تین ماہ کے بعد موسم خزاں میں ہندوستان آ گئے وہ ۷ جون کو لندن پہنچے ۔ اور سر تھیوڈور ماریسن کی معیت میں انہوں نے لندن کے میڈیکل کالجوں اور مشہور و معروف ہسپتالوں کا معائنہ کیا ۔ سر موصوف کسی زمانہ میں علیگڈھ کالج کے پرنسپل رہ چکے تھے ۔ انہوں نے بہت سا وقت انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کی لائبریریوں میں گذارا ۔ وہاں سے آکسفورڈ اور کیمبرج میں گئے ۔ اور کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ای ۔ جی ۔ براؤن سے ملاقات کی ۔ پھر لندن میں واپس آ کر ۲ جولائی کو شہنشاہ ہند کے

کارونیشن دربار میں شریک ہوئے۔ یہاں سے پیرس روانہ ہوئے۔ اور اپنے احباب کے توسط سے وہاں کے مشہور سینٹ ہسپتال کا معائنہ کیا۔ اور بہت سے تاریخی مقامات دیکھے۔ پیرس سے برلن گئے۔ جہاں انہوں نے اپنے طبیہ سکول دہلی کو کالج کی شکل میں منتقل کرنے کے لئے وہاں کے تمام شفاخانوں کا معائنہ کیا۔ اورینٹل لائبریری ان کے لئے خاص طور پر کھول دی گئی۔ وی آنا میں بھی ان کی یہ تحقیقات جاری رہی ؛

قسطنطنیہ میں انہوں نے دیر تک قیام کیا۔ یہاں انہوں نے ان تمام باتوں کا مطالعہ کیا۔ جو طبیہ کالج دہلی کے لئے مفید ہو سکتی تھیں۔ یہاں پر ان کو ترکی مسئلہ کے متعلق گہری دلچسپی پیدا ہو گئی۔ قاہرہ میں بھی وہ بہت دن ٹھیرے انہوں نے جامعہ ازہر کو دیکھا۔ ترکی اور مصر میں انہوں نے اپنے بہت سے پرانے شاگرد دیکھے۔ جنہوں نے ان کا پُرجوش خیر مقدم کیا ؛

جب دہلی ہندوستان کا دارالحکومت بنایا گیا۔ تو لیڈی ہارڈنگ نے غربا کے حالات کا گہری نگاہوں سے مطالعہ کیا۔ اور ان کی طبی امداد و اعانت کے لئے ہمدردی کا ہاتھ بڑھایا۔ اور اس کام کے لئے انہوں نے حکیم اجمل خاں سے استفادہ کیا۔ اس نازک وقت میں جبکہ لارڈ ہارڈنگ پر دہلی میں کسی شقی القلب انسان کی طرف سے بم پھینکا گیا۔ اور وہ خطرناک طور پر زخمی ہو کر صاحب فراش ہو گئے۔ اور خود لیڈی ہارڈنگ اس حادثے سے بال بال بچ گئیں۔ اس وقت حکیم اجمل خاں کی خاندانی اور انسانی ہمدردی ان کے شریک حال رہی۔ اور انہوں نے اس موقع پر اپنی بلند ہمتی کا ثبوت دیا جس کی وجہ سے

لارڈ اور لیڈی ہارڈنگ نے ان کی خاندانی شرافت اور قابلیت کا دلی اعتراف کیا۔ اور یہ دوستی اہم نتائج کی آئینہ دار ہوئی۔ چنانچہ جب حکیم صاحب نے اپنے نئے ہسپتال کا کام تکمیل کو پہنچایا۔ تو انہوں نے اس کا نام بطور یادگار لارڈ اور لیڈی ہارڈنگ ہسپتال قرار دیا۔ اور قریباً ایک سال کے بعد سیاسی مباحثات کے دوران میں مہاتما گاندھی نے ان سے بیان کیا۔ کہ ہسپتال کی عمارت میں لیڈی اور لارڈ ہارڈنگ کی تصاویر آویزاں ہونی چاہئیں۔ انہوں نے اس کی تعمیل کی۔ جس سے مہاتما گاندھی بہت خوش ہوئے ؛

وہ صرف حکیم ہی نہیں تھے۔ طبی تحریروں پر بھی انہیں دستگاہ کامل حاصل تھی۔ انہوں نے بہت سی طبی کتب تصنیف کیں۔ جو مقبول عام ہوئیں۔ ان میں "طبی تعارف" اور "طاعون" خاص اہمیت رکھتی ہیں ؛

وہ اپنی خاندانی روایات کے مطابق سالہا سال سے پبلک کاموں میں دلچسپی لیتے تھے۔ لیکن یورپ کی سیاحت کے بعد ان کی دلچسپیوں میں نمایاں اضافہ ہو گیا۔ یورپ سے واپس آکر انہوں نے دیکھا۔ کہ ہندو مسلم اتحاد ملکی لوازمات میں سے ہے۔ اور اس کے بغیر ملک آزاد نہیں ہو سکتا۔ وہ اس کے خاص محرک بن گئے ؛

۱۹۱۸ء میں انہوں نے ملک کی سیاسی زندگی میں بہت تھوڑا حصہ لیا لیکن علیگڈھ کالج اور مسلم یونیورسٹی کے لئے صبر و سکون سے کام کرتے رہے۔ وہ مسلم لیگ کے ممبر بھی تھے۔ بعد میں اس کے وائس چیئرمین منتخب

لئے گئے۔ انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کا سرگرمی سے خیر مقدم کیا۔ اور سنہ مذکور میں سیاسیات کے ماہر کامل ہو گئے۔ اسی سال دسمبر میں دہلی میں کانگرس کا اجلاس ہوا۔ اور وہ اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر بنائے گئے جس میں انہوں نے نہایت قابلیت سے اپنا فرض سرانجام دیا ۔

کانگرس کے بعد علالت طبع۔ ہسپتال کے مریضوں کا معائنہ کرنے۔ اور اپنے طبیہ میڈیکل سکول کے ذریعہ ہندوستانی عورتوں میں علم طب کو ترقی دینے کی وجہ سے ان کی سیاسی سرگرمیاں کم ہو گئیں۔ اور ان خاموش تحریکات کے دوران میں اچانک اپریل ۱۹۱۹ء میں پنجاب میں شورش نمودار ہوئی۔ اور وہ شبانہ روز عامۃ الناس کے درمیان دوستی اور اتحاد پیدا کرنے میں منہمک ہو گئے۔ سوامی شردھانند کے توسط سے یہ دوستی کامیاب رہی۔ اور شہر دہلی مارشل لا سے محفوظ رہ گیا۔ اسی زمانہ میں وہ خلافت کانفرنس منعقدہ امرتسر کے صدر تجویز ہوئے۔ اور اپنے ہنگامہ خیز خطبۂ صدارت سے انہوں نے ملک کی فضا کو مکدر ہونے سے بچا لیا ۔

۱۹۲۰ء میں وہ مہاتما گاندھی کے خاص معاون بن گئے۔ اور جب مسٹر سی۔ آر۔ داس احمد آباد کانگرس ۱۹۲۱ء کے سلسلہ میں گرفتار کر لئے گئے تو ان کو کانگرس کا صدر بنایا گیا۔ مہاتما گاندھی کی گرفتاری اور قید کے بعد کچھ وقت کے لئے اس ساری تحریک کے صدر الصدور بنائے گئے۔ خرابیٔ صحت اور کمزوری کے باوجود انہوں نے اس کام کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔ اس وقت ڈاکٹر انصاری ان کے خاص معاونین میں سے تھے۔ اور یہ دوستی ہر لحظہ

قریب تر ہوتی گئی ٭

مارچ ۱۹۲۲ء میں جب مہاتما گاندھی گرفتار کر کے صابرمتی جیل میں بند کر دیئے گئے۔ تو انہوں نے مہاتما گاندھی کو ایک مکتوب لکھا۔ جو ان کے دلی جوش کا اظہار کرتا ہے ٭

"میں آپ کی گرفتاری پر بہت خوشی محسوس کرتا ہوں جب میں دیکھتا ہوں کہ ملک قومی تحریک میں اسی دلچسپی کا اظہار کر رہا ہے۔ جو آپ کی نظربندی سے پہلے تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر خاص خوشی ہوتی ہے۔ کہ ملک حقیقی مصالحت کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ اور یہ اس امر کی صریح دلیل ہے۔ کہ ملک میں عدم تشدد کا جذبہ کارفرما ہے۔ جو ہماری کامیابی پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ ہمارے ملک کی ترقی کا راز ہندو مسلم اور دیگر ہندوستانی قوموں کے اتحاد میں منحصر ہے۔ اور میں دیکھتا ہوں۔ کہ ہندوستان کی دو بڑی قومیں یوماً فیوماً قریب تر ہوتی جا رہی ہیں۔ اس لئے میں محسوس کرتا ہوں کہ خلافت اور سوراج کا مسئلہ حل ہونے والا ہے ٭

میں اخیر میں آپ کو اپنی دعاؤں میں شریک کرتا ہوں۔ اور یقین دلاتا ہوں۔ کہ اگرچہ میری صحت ملک کی خدمت کرنے کے قابل نہیں رہی۔ لیکن میں اس وقت تک اپنے فرض کو انجام دوں گا۔ جب تک مسٹر سی۔ آر۔ داس ہمارے درمیان آ جاتے ہیں۔ میرا خدا اس کام میں ہماری مدد کرے۔ جس کو آپ نے اور ملک نے سچائی کی خاطر اٹھایا ہے" ٭

افسوس! کہ ان کی صحت روز بروز خراب ہوتی گئی - اور وہ ملکی تحریکات سے بہت حد تک علیحدہ ہو گئے۔ آخرکار یہ خرابی صحت ان کی موت کا باعث ہوئی - اور وہ ۱۹۳۲ء میں ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے ؎

سر علی امام

وہ ۱۱ر فروری ۱۸۶۹ء کو نیورا کے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ جو پٹنہ کے قریب ایسٹ انڈین ریلوے پر ایک چھوٹا سا سٹیشن ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت زید سے ملتا ہے۔ آپ کے آبا و اجداد مغلیہ حکومت کے زمانہ میں ہندوستان میں آئے تھے۔ جن میں سے مُلّا سعد شہنشاہ اورنگ زیب کے استاد تھے۔ مُلّا سعد کا بیٹا نواب سید خاں حکومت وقت کا وزیر تھا۔ اور ان کے جدامجد میں سے نواب میر عسکری لارڈ کلائیو کے زمانہ میں نواب بنگال کے ماتحت کمانڈر انچیف تھے۔ اور ان کے پردادا خان بہادر سید امداد علی پٹنہ کے پنشن یافتہ سبارڈینیٹ جج تھے۔ ان کے بیٹے خان بہادر شمس العلماء سید وحید الدین پہلے ہندوستانی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایک ڈسٹرکٹ اور سشن جج تھے۔

سر علی امام کے باپ شمس العلماء نواب سید امداد امام پٹنہ کالج میں عربی اور تاریخ کے پروفیسر تھے۔ اور اردو کے بے مثل شاعر۔ سحر طراز ادیب اور جادو نگار مصنف تھے۔ اور اثرؔ تخلص فرماتے تھے۔ اپنے وقت کے مشہور اوقات اور بے عدیل حکیم تھے۔ آپ کی ایک فلسفیانہ کتاب "مرأۃ الحکماء" کا ترجمہ سویڈن کی زبان میں ہو چکا ہے۔ جس پر شاہ سویڈن نے آپ کی قابلیت کی صحیح معنوں میں داد دی تھی ؂

انہوں نے ابتدائی تعلیم آرہ کے سکول میں اور بعد ازاں پٹنہ کالج میں حاصل کی۔ ستمبر ۱۸۸۸ء میں وہ اپنی تعلیم کو مکمل کرنے کے لئے انگلستان تشریف لے گئے۔ اور جون ۱۸۹۰ء میں بیرسٹرایٹ لاء کا ڈپلومہ حاصل کر کے ہندوستان میں واپس آگئے۔ اور ۱۹۰۹ء میں سٹینڈنگ کونسل کے ممبر مقرر کر دیئے گئے۔

وہ چھ سال تک پٹنہ ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپلٹی کے ممبر رہے۔ اور چھ سال تک انہوں نے اپنے چچا خان بہادر سید فضل امام مرحوم کی جگہ میونسپلٹی کے وائس چیئرمین کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۰۳ء میں وہ علیگڑھ کالج کے ٹرسٹی منتخب کئے گئے۔ علیگڑھ کالج کے فنڈ میں غبن ہونے کے باوجود انہوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے کاموں میں پوری دلچسپی لی۔ ۱۹۰۹ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے فیلو بنائے گئے۔

۱۹۱۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ امرتسر کے صدر انتخاب کئے گئے۔ ان کے خطبہ صدارت پر اس سے زیادہ تبصرہ کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے اپنے آپ کو پہلا ہندوستانی ثابت کیا۔ وہ ۱۹۰۹ء کی بہار پراونشل کانفرنس منعقدہ بھاگل پور میں شریک ہوئے۔ جہاں مسٹر گوکھلے آنجہانی اور ان کے درمیان ایک کانفرنس ہوئی۔ اور ان دونوں قائدین کی طویل ملاقاتوں کا نتیجہ ایک قرارداد کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جو مشترکہ انتخاب کے متعلق کانفرنس میں پیش ہوئی۔ مسٹر علی امام نے اس قرارداد کی تائید کی۔ جو مسٹر دیپ نارائن سنگھ کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔ مسٹر گوکھلے نے سر علی امام کی قابلیت پر ایک زبردست رائے ظاہر کی تھی۔ اور خود لارڈ مارلے نے ان کی

زبردست شخصیت کا اعتراف کیا تھا۔ اور جب سنہا اپنے عہدہ سے مستعفی ہوئے تو سر علی امام وائسرائے کی کونسل کے قانونی رکن بنائے گئے ؛

سر علی امام سیاسیات کے مسلم الثبوت استاد اور زبردست لبرل تھے انہوں نے کیمبرج میں ایک ایڈریس کے جواب میں کہا تھا۔ کہ انگریزی تعلیم نے ہندوستانیوں کو حب الوطنی کا سبق دیا ہے مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے آپس میں اور حکومت سے مل کر کام کریں ان کا نصب العین یہ تھا۔ کہ وہ حکومت خود اختیاری زیر سایہ برطانیہ حاصل کریں انہوں نے مسٹر ڈی سی گھوس سے پہلے ہندوستانی اور آخری مسلمان ہونے کی حیثیت سے ملاقات کی۔ اور انہوں نے ان خیالات کو ذیل کے الفاظ میں واضح کیا۔ کہ "مسلمانوں کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ کہ وہ پہلے ہندوستانی اور بعد ازاں مسلمان ہیں۔ اور ہندوؤں کو بھی اپنے لئے یہی نصب العین قرار دینا چاہیئے۔" وہ اکتوبر سنہ ۱۹۱۱ء میں وائسرائے کی اگزکٹو کونسل کے ممبر مقرر ہوئے۔ انہوں نے کونسل میں بڑی قابلیت سے اپنا فرض انجام دیا۔ اور ہز اکسیلنسی لارڈ ہارڈنگ نے ان کی تقریروں میں ان کی پبلک خدمات کی داد دی۔ جو انہوں نے دہلی کے کونسل ہال میں مارچ سنہ ۱۹۱۵ء میں کہیں ؛

نومبر سنہ ۱۹۱۷ء میں وہ مسٹر جسٹس شرف الدین کے ریٹائر ہونے پر پٹنہ ہائیکورٹ کے بنچ میں شریک ہو گئے۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں وہ ہز اگزالٹڈ ہائی نس نظام حیدرآباد کی اگزکٹو کونسل کے صدر منتخب کئے گئے۔ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء میں ہز اکسیلنسی وائسرائے نے ان کو لیگ آف نیشنز میں برطانوی ہندوستان کا

نمائندہ انتخاب کیا - وہ پہلے ہندوستانی نمائندہ تھے - جو لیگ آف نیشنز کے پہلے اجلاس میں شریک ہوئے - واپسی پر پھر حیدر آباد میں اپنی ملازمت پر آ گئے - مگر ستمبر ۱۹۲۲ء میں انہوں نے معاً بلا وجہ اپنے عہدہ سے استعفےٰ دے دیا - اور فوراً پٹنہ میں آ کر پریکٹس شروع کر دی - لیکن جلدی ہی ہز اگزالٹڈ ہائی نس نظام دکن نے ان کو پھر اپنی ملازمت میں لے لیا - تاکہ وہ اضلاع برار کی واگذاری کے لئے پروپگنڈا کریں - جو ۱۸۵۳ء سے حکومت برطانیہ کے قبضۂ اقتدار میں آئے ہوئے ہیں - چنانچہ وہ ۱۹۲۳ء کے وسط میں انگلستان تشریف لے گئے - تاکہ حکومت سے اس کے لئے کوئی تسلی بخش سمجھوتہ کر سکیں - انہوں نے حکومت کے سرکردہ اراکین سے اس مضمون پر گفتگو کی - اور نہایت دلچسپی سے اس کا پروپگنڈا کیا جس سے بہت سے انگریزی رسالوں اور اخبارات نے اس مسئلہ میں دلچسپی لینا شروع کر دی - انہوں نے اس سلسلہ میں اپنے برادران وطن کی خدمات بھی بہت حد تک انجام دیں - اور جب مسٹر شاستری کینیا سے انگلستان واپس آئے - تو انہوں نے اگست ۱۹۲۳ء میں سیسل ہوٹل میں اس ہندوستانی نائب کی مہمان نوازی کی - ۱۹۲۴ء میں وہ ہندوستان میں واپس آ گئے - اور بمبئی میں ایسوشی ایٹڈ پریس کے نمائندہ سے ملاقات کی - جس میں ریفارم سکیم کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا - اور ملک کی سالہا سال ایسی شایانِ شان خدمت انجام دی - کہ ابد الآباد تک یادگار رہے گی افسوس کہ موت کے زبردست ہاتھ نے اک کے ایک قائدِ اعظم کو

ہم سے چھین لیا ۔ وہ اواخر ۱۹۳۲ء میں اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف ہمیشہ کے لئے کوچ کر گئے ۔

سرجگدیش چندربوس

وہ ۲۳ر نومبر ۱۸۵۸ء کو پیدا ہوئے جبکہ ہندوستان کے دل پر غدر کے زخم ابھی ہرے تھے۔ زمانہ طالب علمی سے ہی ان پر قومیت کا رنگ غالب تھا۔ ان کا اپنا بیان ہے۔ کہ گو میرے معاصر انگریزی مدارس میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ تاکہ شائستہ کہلائیں۔ لیکن مجھے ایک دیسی مدرسہ میں داخل کیا گیا تھا۔ جہاں میرے ساتھی طلبہ ان مزدوروں کے لڑکے تھے جنہیں آج کل نیچ ذات کہنا رواج میں داخل ہے"۔

وہ پہلے کلکتہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے گئے۔ بعد میں سٹر بوس کرائسٹ کالج کیمبرج میں شریک ہونے کے لئے انگلستان روانہ ہو گئے۔ وہاں سے لوٹ کر اپنی سائینس کی تحقیقات میں مشغول ہو گئے۔ بنگال کے بعض قصبوں میں وہ عرصہ تک بطور پروفیسر تعلیم دیتے رہے۔ پھر انہوں نے اپنا ایک علیحدہ دار التجارب قائم کیا جس نے مغربی دنیا کو حیرت میں ڈال دیا"۔

ابتداً ان کے نظریات کا مذاق اڑایا گیا۔ اور ان کی پُر زور مخالفت کی گئی۔ خود ہندوستانی ماہران فن نے ان کی قابلیت کا احساس کرتے ہوئے بھی ان کو ایک سکول ماسٹر سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ لیکن انہوں نے بالکل پروا نہ کی۔ اپنی تحقیقات کو جاری رکھا۔ اور علمی تجربات کے ذریعہ اپنے

نظریوں کی صداقت ثابت کردی۔ آخر کار دنیائے سائینس کے محسن اعظم قرار پائے۔ انہوں نے اپنی اولین تحقیقات دوہرے انعطافی منشوروں سے برقی شعاعوں کی تخطیب (Satim polarie) اور برقی شعاعوں کا دہرا انعطاف (Ref laction) کے متعلق کی جس نے دنیائے سائینس کی توجہ آپ کی طرف مبذول کردی۔ لارڈ کلون نے جو علم طبیعیات کا مشہور ماہر تھا ان کے کارناموں کو محیر العقول قرار دیا۔ اور آپ کی شاندار کامیابی تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کئے۔ حکومت برطانیہ نے ان کی ستائش یوں کی۔ کہ ان کو اپنی تحقیقات مشہور ماہرین سائینس کے روبرو پیش کرنے کے لئے یورپ روانہ کردیا ؛

اس کے بعد انہوں نے نہایت سرگرمی سے پودوں کی خراش پذیری اور حس وحرکت پر تحقیقات شروع کردی۔ اور تجرباتی ریکارڈ رکھ کر انہوں نے تبلا دیا۔ کہ جس طرح جانوروں میں قوت حس وخراش پذیری موجود ہے۔ اسی طرح پودوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ اور جو خراش پذیری پودوں میں موجود ہے۔ وہ جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے ؛

۱۹۱۱ء میں ان کو دربار تاجپوشی دہلی کے موقع پر کمپینین آف دی آرڈر سٹار آف انڈیا کے تمغہ سے مفتخر کیا گیا۔ انہوں نے سب سے پہلے تحقیقات وعلمی تجربات سے یہ ثابت کردیا۔ کہ کائنات کی ہر شے میں حتےٰ کہ غیر مادی اشیاء میں بھی زندگی کی روح موجود ہے ؛

انہوں نے آلات کے ذریعہ ثابت کیا کہ پتھر لکڑی اور دیگر اشیاء میں بھی قوت حس موجود ہے۔ اور انسانوں کی طرح ان کو بھی آرام کی ضرورت ہے۔

اور جاندار اشیاء کی طرح ان میں بھی عصبی عمل و ردعمل پایا جاتا ہے۔ انہوں نے سائنٹیفک تجربوں سے اس قدیم فلسفہ و نظریہ کو صحیح ثابت کیا۔ کہ کائنات عالم ایک قسم کے احساس مسرت و غم میں مبتلا ہے۔ ان کارناموں کی وجہ سے وہ یورپ کے مشہور و معروف جامعات میں تقریر کرنے کے لئے بلائے گئے۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں ان کو سی۔ آئی۔ ای" کا خطاب ملا۔ اور سنہ ۱۹۱۷ء میں ان کو سر کا خطاب دیا گیا۔ کلکتہ۔ الہ آباد۔ بنارس۔ اور بغداد کے جامعات سے ڈاکٹر آف سائینس کی ڈگری ملی۔ جامعہ ایبرڈین نے ان کو ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ اور روی آنا سائینس اکاڈیمی اور زنیکا اشتمالی ادارۂ سائنس کے رکن بنائے گئے وہ ریزیڈنسی کالج کلکتہ کے پروفیسر اور بوس ادارۂ تحقیقات کے بانی اور نگران کار تھے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں بین الاقوامی سائینس کانگرس کے نمائندے منتخب ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۷ء سنہ ۱۹۱۲ء اور سنہ ۱۹۱۷ء میں یورپ اور امریکہ کے وفد سائینس کے رکن بن گئے۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں انڈین سائینس کانگرس کے صدر تھے کچھ عرصہ تک بین الاقوامی اتحادی کمیٹی اور جمعیت اقوام کے ممبر بھی رہے۔ اور آخر کار ۲۳ نومبر سنہ ۱۹۳۷ء کی سہ پہر کو حرکت قلب کے بند ہونے سے ہندوستان کا یہ مشہور سائینسدان ہمیشہ کے لئے رہگرائے عالم جاودانی ہو گیا۔

مسٹر محمد علی جناح

وہ ۱۸۷۶ء میں کراچی میں پیدا ہوئے۔ وہ بچپن سے ہی ذہین اور ہوشیار واقع ہوئے ہیں۔ ابتداءً انہوں نے کراچی کے ایک مدرسہ میں دینی تعلیم حاصل کی۔ پھر بمبئی یونیورسٹی کے ایک سکول میں میٹرک پاس کیا ؛

وطنی و ملی محبت شروع ہی سے ان کے دل میں موجود تھی۔ اور وہ انہی خدمات کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے کے آرزومند رہے ؛

۱۸۹۲ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے لئے انگلستان روانہ ہوئے۔ اس وقت وہ اپنی عمر کے سولہویں سال میں تھے۔ چھ سال تک وہاں رہے۔ لیکن انہوں نے وطن کو فراموش نہیں کیا۔ انہوں نے ہندوستانی طلبہ کی ایک سوسائٹی قایم کی۔ جو بہت مفید ثابت ہوئی۔ یہاں ہندوستان کے مختلف حصوں کے طلبہ آپس میں تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔ اور ایک دوسرے سے مستفید ہوتے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں انہوں نے وطن کی طرف مراجعت کی۔ اس وقت ان کے خاندانی حالات میں تغیر پیدا ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کی راہ خود تلاش کی۔ اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ تین سال میں انہوں نے اپنے معاصرین میں نام پیدا کیا اور جلدی ہی ہائیکورٹ کے ایڈووکیٹ بن گئے قانونی دنیا میں ان کو جو شہرت و عظمت حاصل ہے۔ وہ بہت کم ہندوستانیوں کے

حصے میں آئی ہوگی۔ اپنی انتہائی مصروفیت کے باوجود وہ ملی و وطنی خدمات کے لئے وقت نکالتے رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا اور دیانتداری کو اپنا راہنما بنایا۔ انہوں نے اپنی خدمات کا صلہ نہ حکومت سے طلب کیا اور نہ ہی وطن سے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ پُرخلوص ملی و وطنی خدمات میں گذارا۔ انہوں نے حکومت وقت اور پبلک پر بے باکانہ نکتہ چینی کی۔ اور جادۂ صداقت سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹے۔

۱۹۲۵ء میں امپیریل لیجسلیٹو اسمبلی میں انہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ کہ "میں کبھی کسی ملازمت کا امیدوار نہیں ہوا۔ اور نہ مجھے ایسی خواہش ہے میں صاف دل سے اس امر کا اعلان کرتا ہوں۔ کہ میں ملت و وطن کا پرستار ہوں۔ اور کونسل کے ممبروں سے التجا کرتا ہوں۔ کہ وہ متعصبانہ روش کو ترک کر دیں۔ اور کونسل کی فضا کو ہندو مسلم جھگڑوں سے مکدر ہونے سے بچائیں۔ تاکہ یہ کونسل صحیح معنوں میں قومی پارلیمنٹ ثابت ہو۔"

ان کا دل شروع ہی سے حب وطن کے جذبات سے سرشار رہے اور وہ مسٹر سی۔ آر۔ داس اور بینرجی ایسے استادوں کے آگے زانوئے تلمذ تہ کر چکے ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی ہیں۔ اور وطنی مفاد پر ہر قسم کی قربانی کرنے پر تیار ہیں۔ ان کے دل میں ایک سچا اسلامی جوش ہے۔ جو آہستہ آہستہ اپنا کام کر رہا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اسلامی مفاد کو مقدم سمجھا۔ انہوں نے سب سے پہلے ایلیمنٹری ایجوکیشن بل کی تائید میں آواز بلند کی۔ اور ۱۹۱۳ء میں وقف بل کو ضروری ترمیمات کے ساتھ پاس کرایا۔ آپ ہمیشہ حلقۂ بمبئی سے بلا مقابلہ

منتخب ہوتے رہے ہیں۔ اور کونسل میں ملک و قوم کی خاطر جنگ آزما رہے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے فرقہ وارانہ کشمکشوں کی مخالفت کی مگر مسلمانوں کے جائز مطالبات کو انہوں نے کبھی نظر انداز نہیں کیا ؛

۱۹۱۶ء میں وہ مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ قبل ازیں مسلم لیگ چند "جی حضوریوں" کی ایک مختصر جماعت تھی۔ لیکن ان کے صدر منتخب ہونے پر اس کے اندر ایک روح بیداری پیدا ہو گئی ۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں واضح طور پر کہہ دیا۔ کہ "ہم اس امر کو کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتے کہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ہمیں اپنے ملک کے نظم و نسق میں کوئی دخل نہ ہو۔ ہم اپنے ملکی بھائیوں کے جذبات کو دوسروں کی نسبت بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے۔ کہ ہماری قسمتوں کی اجارہ داری دوسروں کے سپرد ہو" انہوں نے حکومت کو بھی مخاطب کر کے کہا کہ وہ اہل ہند کی قدر کرے اور وہ بھی اس کو بنظر استحسان دیکھیں ؛

ان کے چودہ نکات ہنگامہ خیز شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ جن میں انہوں نے مسلمانوں کے جائز مطالبات کو اپنے ہندو بھائیوں کے سامنے پیش کیا ان کا خیال ہے۔ کہ سیاسی مسائل رواداری سے سلجھا کرتے ہیں۔ چونکہ وہ مسلمانوں سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ اسلئے مسلمان اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کے لئے چند تحفظات چاہتے ہیں نیشنلسٹ ہونے کے باوجود انہوں نے فرقہ وارانہ نیابت کا مطالبہ بھی کیا ہے۔ جس میں کہا ہے۔ کہ یہ بطور پالیسی نہیں۔ بلکہ بطور ضرورت یہ مطالبہ اختیار کیا گیا ہے۔ جب فی مابین اعتماد حاصل ہو جائے گا۔ تو اس سے بھی

مسلمان دست بردار ہو جائیں گے ؛

۱۹۱۷ء میں جب لارڈ مانٹیگو ہندوستان میں تشریف لائے۔ تو مسٹر جناح سے ملاقات کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ کہ ہندوستان میں صرف ایک آدمی ہے۔ جو یورپ کی طرح پارلیمینٹری بحث کرنے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اپنے خیالات صحیح طور پر دوسروں کے سامنے پیش کرسکتا ہے"

۱۹۳۰ء میں وہ گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں لندن گئے۔ اور آزادانہ وطنی مطالبات حکومت کے سامنے پیش کئے۔ اور وہاں کے مدبّرین کو تسلیم کرنا پڑا۔ کہ آپ ایک زبردست سیاست دان اور وطن کے سچے رہنما ہیں۔ بیان کیا جاچکا ہے۔ کہ ان کے ضمیر نے کبھی گوارا نہیں کیا۔ کہ جاہ طلبی کے لئے قوم کے مفاد کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ورنہ ہائیکورٹ کی ججیاں اور کونسل کی ممبریاں آج سے کئی سال پہلے آپ کے قدموں میں ہوتیں۔ اور یہ وہ چیزیں ہیں۔ جن کے لئے بڑے بڑے رہنما ملک و قوم سے غداری کے لئے تیار ہو جاتے ہیں ؛

وہ ہندوستان کے چوٹی کے وکلا میں شمار ہوتے ہیں۔ اور اوسطاً ۲۵ ہزار روپے ماہوار کی آمدن رکھتے ہیں۔ اکثر آپ نے قومی مفاد کے لئے بڑی بڑی فیسوں کو ٹھکرا دیا۔ اسمبلی میں جن دنوں آپ اٹاوہ پیکٹ پر بحث کر رہے تھے۔ اور بمبئی کے ایک سیٹھ نے ایک لاکھ روپیہ کی رقم پیش کرتے ہوئے اپنے مقدمہ کی پیروی کے لئے بلانا چاہا تو آپ نے اس رقم کو ٹھکرا دیا ؛

انہوں نے آج تک کسی کو دعوت نہیں دی۔ لیکن اسکا یہ مطلب نہیں کہ

وہ مہمان نواز نہیں - وہ کہتے ہیں - کہ میں اپنی قوم کو اس قدر پست کرنا نہیں چاہتا - کہ وہ ایک چائے کی پیالی کے لئے میری ہاں میں ہاں ملائے - بلکہ میری خواہش ہے - کہ وہ اس قدر صلاحیت پیدا کرے - کہ نیک و بد کی تمیز کر سکے - وہ چاہتے ہیں - کہ کونسلوں میں ایسے آدمی جائیں جو صحیح معنوں میں ملت و وطن پرست ہوں - اس کے لئے آپ نے پارلیمنٹری بورڈ بنایا ہے - جس میں یقیناً ان کو کامیابی ہوگی ؎

پنڈت جواہر لعل نہرو

آپ ۱۴ر نومبر ۱۸۸۹ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے - ان کے والد پنڈت موتی لعل نہرو تھے - جو کشمیر کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے - ان کی ابتدائی تعلیم ایک پرائیویٹ اتالیق کے ذریعہ ہوئی - اسلئے ان کا بچپن انتہائی خاموشی میں گذرا - اور وہ سکول کے لڑکوں کی صحبت سے محروم رہے - گیارہ سال کی عمر میں وہ ایک نئے اتالیق مسٹر فرڈینیڈ ٹی بروکس کے سپرد کئے گئے - جو ایک پرجوش تھیوسوف تھے - تین سال تک وہ ان کی نگرانی میں تعلیم حاصل کرتے رہے - اور ان سے بہت حد تک متاثر ہوئے اس زمانہ میں ایک پنڈت صاحب بھی ان کے اتالیق تھے - جو ان کو سنسکرت اور ہندی کی تعلیم دیتے تھے - مسٹر بروکس کی تعلیم نے ان کے دل میں مطالعہ کا شوق پیدا کر دیا اور انہوں نے بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا - بروکس کی صحبت نے ان کو سائنس سے بھی واقف کر دیا - اور انہوں نے ایک مختصر سا معمل بنا کر کیمیا اور طبعیات کے تجربے شروع کر دیئے - تیرہ سال کی عمر میں وہ تھیوسوفی انجمن کے رکن ہو گئے - اور مسز بیسنٹ نے ان کے داخلہ کی افتتاحی رسم ادا کی - اور بعد ازاں وہ تھیوسوفوں کی کانفرنس منعقدہ بنارس میں شریک ہوئے اب مسٹر بروکس رخصت ہو گئے اور ان کو تھیوسوفوں سے زیادہ سابقہ

نہ رہا۔ اور یہ دورِ زندگی بہت جلد ختم ہوگیا ۔ وہ ۱۹۰۵ء میں سکول کی تعلیم کے لئے انگلستان بھیج دیئے گئے۔ اس زمانہ میں روس و جاپان میں لڑائی شروع تھی۔ اواخر مئی میں وہ لندن پہنچے۔ ان کے والد پنڈت موتی لعل نہرو ان کی والدہ اور ایک چھوٹی بہن بھی ان کے ہمراہ تھے۔ خوش قسمتی سے ان کو ہیرو میں جگہ مل گئی۔ اس وقت ان کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ جو داخلہ کی مقررہ عمر سے کچھ زیادہ تھی۔ ان کے افراد خاندان یورپ کے دیگر ممالک میں چلے گئے۔ اور وہاں سے ہندوستان واپس ہو گئے ؛

ابتداءً وہ لاطینی زبان سے بہت کم واقف ہونے کی وجہ سے ہیرو میں چھوٹے درجہ میں داخل کئے گئے۔ لیکن جلدی ہی انہوں نے ترقی کی منزلیں طے کرلیں۔ اور بہت سے مضامین میں اپنے معاصرین سے سبقت لیگئے۔ ۱۹۰۵ء میں پارلیمنٹ کے عام انتخاب میں لبرل جماعت کو کامیابی ہوئی۔ اور ۱۹۰۶ء میں ان کے استاد نے نئی حکومت کے متعلق بہت سے استفسارات کئے۔ جن کا صرف انہوں نے ہی برجستہ جواب دیا۔ اور مجلس وزراء کی پوری فہرست سنا دی۔ ان کے دل میں قومی جذبات موجزن تھے ۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے دل سے خواہاں تھے۔ ۱۹۰۷ء میں ان کی عمر ۱۷ - ۱۸ سال کی تھی۔ جبکہ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہو گئے۔ اور تین سال تک وہاں رہے۔ ادب ۔ تاریخ ۔ سیاسیات ۔ اور معاشیات سے انہیں بہت دلچسپی تھی۔ اور وہ ان مضامین پر آزادانہ گفتگو کیا کرتے تھے۔ اس وقت ان پر آسکر وائلڈ اور والٹر پیٹر کا رنگ چڑھ چکا تھا۔ جس میں دھندلی سی لذت پرستی تھی'

سنہ ۱۹۰۷ء میں ہندوستانی سیاسیات ہیجان کی حالت میں تھیں۔ اور وہ ان میں آزادی سے حصہ لینے کے آرزومند تھے۔ کیمبرج کی تین سالہ زندگی میں انہوں نے کوئی تقریر نہیں کی۔ لیکن ان کے دل میں یہ سوال پیدا ہو رہا تھا۔ کہ انہیں کونسا پیشہ اختیار کرنا چاہیئے۔

انڈین سول سروس ان دنوں بہت بڑی چیز سمجھی جاتی تھی۔ مگر یہ تجویز ان کو پسند نہ آئی۔ کیونکہ ان کی عمر مقررہ میعاد سے کم تھی۔ غرض انہوں نے بیرسٹری کا آبائی پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور وہ انرٹمپل میں داخل ہو گئے سنہ ۱۹۱۰ء میں کیمبرج سے سند حاصل کر کے رخصت ہو گئے اور بیرسٹری کے امتحانات بھی ایک ایک کر کے پاس کر لئے۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں بیرسٹری کی سند حاصل کی۔ اور سات سال قیام کرنے کے بعد انگلستان سے ہندوستان میں واپس آ گئے۔ اوہر سنہ ۱۹۱۲ء میں ہندوستان پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مسٹر تلک جیل میں تھے۔ انتہا پسند کچلے جا چکے تھے۔ اور تقسیم بنگالہ کی ناکامی کے باعث بنگال پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں بانکی پور میں کانگرس کا اجلاس ہوا۔ اس میں وہ ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

اب انہوں نے ہائیکورٹ میں وکالت شروع کر دی۔ مگر انہوں نے اس کام میں پوری توجہ نہ دی۔ سیاسیات کا مفہوم وہ یہی سمجھتے تھے۔ کہ غیر ملکی حکومت کے خلاف جارحانہ کارروائی کی جائے۔ تاہم وہ کانگرس میں داخل ہو گئے۔ اور کبھی کبھی اس کے اجلاس میں شریک ہوتے رہے۔ وہ

مسٹر گوکھلے سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی سے بہت متاثر تھے۔ لیکن اسکے
سیاسی نقطۂ نظر کو اپنے معیار سے کم سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کی
شرکت کا خیال ترک کر دیا۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ تمام سیاسی
تحریکات رُک گئیں۔ اور ان کی اہمیت کم ہوگئی - قانون تحفظ ہند نے
سارے ملک کو آہنی گرفت میں جکڑ لیا۔ مگر رفتہ رفتہ سیاسی بیداری پھر شروع
ہوگئی۔ مسٹر تلک بھی جیل سے رہا ہو کر آ گئے۔ اور انہوں نے ایک
ہوم رول لیگ قایم کر دی۔ اور دوسری ہوم رول لیگ مسز بیسنٹ نے قایم کر دی
وہ دونوں میں شریک ہو گئے۔ مگر زیادہ تر کام انہوں نے مسز بیسنٹ کی لیگ میں
کیا۔ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کانگرس نے کانگرس اور لیگ کی مشترکہ سکیم مرتب کی
اسی سال مسٹر گاندھی سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی۔ اور اسی سال
مسز سروجنی نیڈو کی الہ آبادی تقریروں سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ اگرچہ
وہ وکالت سے بہت متنفر تھے۔ لیکن ابھی اس کام کو انہوں نے نہیں
چھوڑا تھا۔

۱۹۱۶ء میں ان کی شادی ہوئی۔ اور ۱۹۱۹ء میں رولٹ بل شایع ہوا
جس نے ملک میں اضطراب کی لہر دوڑا دی۔ اسی سال ملک کو خود اختیاری
حکومت کی ایک قسط دی گئی اور مسٹر گاندھی نے ستیہ گرہ کی بنیاد ڈال دی جس
میں ممبروں سے عہد لیا گیا۔ کہ اگر رولٹ ایکٹ نافذ ہو گیا۔ تو وہ اس کی
خلاف ورزی کریں گے - اسی سال پنجاب میں ایک ہنگامہ عظیم برپا ہوا -
مارشل لا جاری ہو گیا۔ جلیانوالہ باغ میں قتل عام ہوا اور ہندوستانی قائدین کے داخلے کی

ممانعت کردی گئی۔ جب یہ سلسلہ ختم ہوا۔ تو لیڈر چاروں طرف سے پنجاب میں آگئے مسٹر واس امرت سر کے علاقہ کی تحقیقات کرنے کے لئے مقرر ہوئے۔ وہ بھی ان کے ساتھ تھے ؛

سنہ ۱۹۲۰ء میں وہ مسوری میں گئے۔ جہاں افغانی اور برطانی نمائندے مصالحت کی گفتگو کر رہے تھے۔ ایک شام ان کو سپرنٹنڈنٹ پولیس کی معرفت صوبجات متحدہ کی حکومت کا خط ملا۔ کہ وہ افغانی وفد سے کوئی تعلق نہ رکھیں انہوں نے اس سے انکار کر دیا ؛

اس پر سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ کہ وہ ڈیرہ دون مجسٹریٹ سے مل لیں چنانچہ جب وہ مجسٹریٹ سے ملے۔ اور ان کو انہوں نے ایک اقرار نامہ پر دستخط کر دینے کے لئے کہا۔ ایک خاص وجہ کے باعث انہوں نے انکار کر دیا اس لئے مجسٹریٹ نے ان کو ۲۴ گھنٹے کے اندر ڈیرہ دون کے ضلع سے نکل جانے کا حکم دیا۔ مسوری سے وہ الہ آباد آگئے۔ جہاں ان کو کسانوں کی تحریک سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ جون سنہ ۱۹۲۰ء کے اولین ہفتہ میں وہ پرتاپ گڑھ گئے۔ جہاں سینکڑوں کسانوں نے اپنی مصیبت کی داستان سنائی۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ دو تین ہفتہ تک پھر پرتاپ گڑھ آئیں گے۔ حسب وعدہ وہ موقعہ پر پہنچے اور دیکھا۔ کہ تمام دیہات جوش و خروش سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ ابھی تک تقریر کرنے سے جھجکتے تھے۔ لیکن کسانوں کے مجمع میں یہ حجاب بھی دور ہو گیا اور انہیں پے در پے کسانوں کے مجمع میں تقریریں کرنا پڑیں ؛

سنہ ۱۹۲۱ء میں انہوں نے دیہاتی علاقوں کا دورہ کیا۔ اسوقت کسانوں

اور مزدوروں کی تحریکات زوروں پر تھیں۔ ۱۹۲۱ء و ۲۲ء میں گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور ۱۹۲۳ء میں ترک موالات کے سلسلہ میں ۳ ہزار اشخاص جیل میں چلے گئے ؎

دسمبر ۱۹۲۱ء میں ان کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اور چھ ماہ کی سزائے قید دی گئی۔ مگر تین ماہ کے بعد رہا کر دیئے گئے۔ اور وہ الہ آباد واپس آگئے اور آتے ہی بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ کی تحریک شروع کر دی۔ مگر جلدی ہی گرفتار ہو کر پونے دو سال کے لئے جیل میں بھیج دیئے گئے۔ ۲۱ جنوری ۱۹۲۲ء کو تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے گئے۔ جن میں وہ بھی تھے۔ اس وقت کانگرس آپس میں دست و گریباں تھی۔ رہا ہونے کے بعد انہوں نے سمجھوتہ کی کوشش کی۔ مگر ناکامی ہوئی۔ اسی سال وہ یو۔ پی۔ کانگرس کمیٹی کے سکرٹری ہو گئے۔ اور چند ہفتہ بعد الہ آباد میونسپلٹی کے صدر بنائے گئے۔ اس وقت کانگرس میں دو جماعتیں تھیں۔ ایک داخلہ کونسل کی حامی۔ اور دوسری مخالف۔ مگر ان کو کسی سے دلچسپی نہ تھی ؎

۱۹۲۳ء کے موسم خزاں میں پٹیالہ اور نابھہ کے درمیان عداوت پیدا ہو گئی۔ حکومت نے مہاراجہ نابھہ کو گدی سے اتار دیا۔ جس پر سکھوں نے احتجاج کیا۔ اور جیتو میں اپنے جتھے بھیجنا شروع کر دیئے۔ پولیس انکو مار مار کر گرفتار کرتی اور دور جنگل میں جا کر چھوڑ دیتی تھی۔ ان کو دعوت دی گئی۔ کہ وہ اپنی آنکھ سے اس واقعہ کو دیکھیں۔ چنانچہ وہ اے۔ ٹی گڈوانی اور مسٹر کے سنتانم کی معیت میں جیتو پہنچے۔ مگر انہیں نابھہ کی حدود سے واپس چلے جانے کا

حکم دیا گیا لیکن وہ پیچھے نہ ہٹے اس پر ان کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا گیا اور دوسرے روز نابھہ جیل میں داخل کیا گیا۔ دو تین دن کے بعد ان کو سازش کے الزام میں عدالت میں پیش کیا گیا۔ اور نابھہ سے نکل جانے کے حکم کی خلاف ورزی میں ۶ ماہ اور سازش کے الزام میں ایک سال قید کی سزا دی گئی۔ لیکن جلدی ہی سپرنٹنڈنٹ جیل نے ان کو تبلایا۔ کہ ان کی سزا ملتوی کر دی گئی ہے وہ فوراً نابھہ سے نکل جائیں۔ اور اجازت کے بغیر داخل نہ ہوں۔ وہ ایک گاڑی میں بیٹھ کر دہلی اور دہلی سے الہ آباد پہنچے ؎

سنہ ۱۹۲۳ء میں کانگرس کا سالانہ اجلاس کوکناڈا میں مولانا محمد علی کی صدارت میں ہوا۔ جنہوں نے ان کو مجبور کیا۔ کہ وہ سکرٹری کا عہدہ قبول کریں ۔ اور انہوں نے اس پر سر تسلیم خم کر دیا۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں وہ لاہور کانگرس کے صدر ہوئے۔ اور سنہ ۱۹۲۵ء میں اپنے والد کی بیماری کے باعث ڈلہوزی چلے گئے۔ اور چند یوم قیام کرنے کے بعد الہ آباد ہوتے ہوئے کلکتہ روانہ ہو گئے۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں الہ آباد میں ایک ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ جس کا انہیں بہت صدمہ ہوا۔ کہ یہ فساد ان کے اپنے شہر میں ہو رہا ہے ؎

دو سال تک وہ الہ آباد میونسپلٹی کا کام کرتے رہے۔ اور دوسرے سال کے اخیر میں انہوں نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں ان کی اہلیہ بیمار ہو گئی ۔ ڈاکٹروں نے انہیں سوئٹزرلینڈ لے جانے کا مشورہ دیا ۔ وہ مارچ سنہ ۱۹۲۶ء کو اپنی بیوی اور لڑکی کے ساتھ بمبئی سے وینس روانہ ہو گئے ۔ سنہ ۱۹۲۶ء کے اخیر میں وہ برلن گئے۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں

ماسکو میں گئے۔ تاکہ سوویٹ کی دسویں سالگرہ کے جشن میں شریک ہوں۔
اسی سال کے اخیر میں وہ ہندوستان میں واپس آگئے۔ اور مدراس پہنچے۔
جہاں انہوں نے ورکنگ کمیٹی میں کامل آزادی۔ خطرہ جنگ وغیرہ کی تجاویز پیش
کیں۔ جو باتفاق رائے پاس ہوگئیں۔ اور وہ دوبارہ کانگرس کے سکرٹری
بن گئے۔

ابھی مدراس کانگرس ختم بھی نہ ہوئی تھی۔ کہ حکیم اجمل خاں صاحب صدر کانگرس
کے انتقال کی خبر چاروں طرف پھیل گئی۔ اس زمانہ میں سائمن کمیشن ہندوستان
میں دورہ کر رہا تھا۔ اور ہر جگہ اس کے خلاف مظاہرے کئے جاتے تھے
اب وہ لکھنؤ آنے والا تھا۔ جس کی بنا پر حکومت نے جلوس نکالنے کی ممانعت
کردی۔ ۱۹۲۸ء میں انہوں نے پنجاب۔ مالابار۔ دہلی اور صوبہ متحدہ کی
کانفرنسوں اور بنگال و بمبئی کے نوجوانوں کی انجمنوں میں صدارت کے فرائض
انجام دیئے۔ اور مزدوروں کے مجمع میں بھی تقریریں کیں۔ جن کا موضوع
سیاسی اور سماجی آزادی ہوتا تھا۔ ۱۹۲۷ء میں جب وہ یورپ سے واپس آئے
تو ان کے خیالات میں اشتراکیت کا عنصر غالب تھا۔ ۱۹۲۹ء میں صوبہ متحدہ
کی کانگرس کمیٹی نے اشتراکی خیالات کی ایک تجویز پیش کی۔ اور آل انڈیا کانگرس
کمیٹی بمبئی نے اس تجویز کے ابتدائی حصہ کو منظور کر لیا جس میں اشتراکیت کا
اصول رکھا گیا تھا۔ اپریل ۱۹۳۰ء میں ان کو پھر گرفتار کر لیا گیا۔ اور نینی تال
سنٹرل جیل میں بھیج دیا گیا۔ اور سب قیدیوں سے الگ رکھا گیا۔ جون
۱۹۳۰ء کو ان کے والد اور ڈاکٹر سید محمود بھی ان کے ساتھ آملے جولائی

۱۹۳۰ء کے آخر میں معلوم ہوا کہ سر تیج بہادر سپرو اور ایم جیکار حکومت اور کانگرس میں مصالحت کی کوشش کر رہے ہیں۔ ۲۷ر جولائی کو سر تیج بہادر سپرو اور جیکار مسٹر گاندھی کا خط لے کر نینی تال جیل میں ان کے پاس پہنچے۔ اور دو دن تک طویل گفتگو ہوتی رہی۔ انہوں نے صاف کہہ دیا۔ کہ جب تک وہ مسٹر گاندھی سے مشورہ نہ کر لیں۔ کوئی تجویز پیش نہیں کی جا سکتی۔ ۸ر اگست کو ڈاکٹر سپرو دوبارہ وائسرائے کا جواب لے کر ان سے ملنے آئے۔ ۱۰ر اگست کو پنڈت موتی لعل نہرو۔ سید محمود اور وہ سپیشل ٹرین پر نینی تال سے پونا پہنچے۔ اور معلوم ہوا۔ کہ وہ اس وقت تک مسٹر گاندھی سے نہیں مل سکتے۔ جب تک سپرو اور جیکار نہ آ جائیں۔ چنانچہ ان کے آنے پر وہ ۱۳۔۱۴۔۱۵ر اگست تک اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ اور انہوں نے وہ کم از کم شرائط پیش کیں۔ جن کی بناء پر وہ سول نافرمانی کو روکنے اور حکومت سے اتحاد عمل کرنے کے لئے تیار تھے۔ ۱۹ر اگست کو وہ پھر نینی تال روانہ ہو گئے۔

راستہ میں پنڈت موتی لعل نہرو کو بخار ہو گیا۔ اور ان کی حالت خراب ہوتی گئی۔ چنانچہ آخر کار ۸ر ستمبر کو پنڈت موتی لعل جیل سے رہا کر دیئے گئے۔ ۱۱ر اکتوبر کو ان کی بھی ششماہی قید کی میعاد ختم ہو گئی۔ اور ان کو رہا کر دیا گیا۔ جنگ آزادی جاری تھی۔ اور اس کی شدت بڑھتی جاتی تھی۔ اور صلح کی مساعی ناکام ثابت ہوتی تھیں۔ ان کی رہائی کے دو تین دن بعد نئے آرڈی ننس جاری ہو گئے۔

اس وقت ان کے سامنے سب سے اہم مسئلہ دیہات میں محصول نہ دینے کی

تحریک کا تھا۔ لگان اور مالگذاری کا زمانہ قریب آگیا تھا۔ اور اس کی وصولی بہت مشکل تھی۔ کیونکہ زراعتی پیداوار کی قیمتیں گر گئی تھیں۔ چنانچہ الہ آباد میں کانگرس کمیٹی کا ایک اجلاس ہوا اور فیصلہ ہوا۔ کہ صرف یہ تحریک منظور کی جائے۔ کہ لگان نہ دیا جائے۔ ۱۲ر اکتوبر کو وہ مسوری کملا کی معیت میں روانہ ہو گئے۔ جہاں ان کے والد پنڈت موتی لعل نہرو بیمار تھے۔ اور تین دن تک وہاں رہے۔ ۱۸ر اکتوبر کو وہ الہ آباد پہنچ گئے۔ راستہ میں انہوں نے کئی مقامات پر کسانوں کے مجمع میں تقریریں کیں +

۱۹ر اکتوبر کی صبح کو انہیں دفعہ ۱۴۴ کا نوٹس ملا۔ مگر ان کی خواہش تھی۔ کہ وہ گرفتاری سے پہلے کسی نہ کسی طرح کسانوں کی نمائندہ کانفرنس میں شریک ہو جائیں۔ جو اگرچہ پرائیویٹ تھی۔ مگر اس میں ۱۶۰۰ ڈیلی گیٹ موجود تھے۔ یہ کانفرنس ضلع الہ آباد میں پوری نمائندگی کر رہی تھی۔ چنانچہ انہوں نے بھی اس کانفرنس میں تقریر کی۔ اور وہاں سے وہ اپنے والد اور دوسرے عزیزوں کو لینے کے لئے سٹیشن کو روانہ ہوئے۔ اور جب وہ گھر پہنچے۔ تو ان کی موٹر روک لی گئی۔ اور ان کو گرفتار کر کے جمنا پار پرانی پارک میں پہنچا دیا گیا۔

چند دنوں کے بعد ان کے مقدمہ کی تحقیقات شروع ہوئی۔ اور الہ آباد کی تقریر کی بنا پر دفعہ ۱۲۴ الف کے ماتحت بغاوت کے جرم میں ۱۸ ماہ کی قید سخت اور ۵۰۰ روپے جرمانہ۔ اور قانون نمک سازی کے ماتحت ۶ ماہ قید اور ۱۰۰ روپیہ جرمانہ۔ آرڈی نینس نمبر ۶ کے ماتحت ۶ ماہ قید اور ۱۰۰ روپیہ جرمانہ کی سزائیں دی گئیں۔ لگان ادا نہ کرنے کی تحریک الہ آباد سے صوبہ متحدہ کے

چند ضلعوں میں پھیل گئی ٭

ایک طرف سیاسی تحریک اور سول نافرمانی اور دوسری طرف کسانوں کی ابتر حالی دونوں چیزوں نے حکومت کو خائف کر دیا۔ کہ کہیں کسانوں میں شورش برپا نہ ہو جائے۔ اُدھر لندن میں گول میز کانفرنس کے اجلاس ہو رہے تھے ٭

یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو کملا بھی گرفتار ہو گئی۔ جو ان کی بہادر بیوی تھی۔ اُدھر گول میز کانفرنس بھی ختم ہو چکی تھی۔ اور جنوری ۱۹۳۱ء کو الہ آباد میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ ان دنوں وہ جیل میں تھے۔ اور رہائی کے بعد ان کو اس کا علم ہوا۔ ۲۶ جنوری کو وہ اور کملا اور ہندوستانی جیلوں کے بہت سے لوگ رہا کر دیئے گئے۔ ان کے والد پنڈت موتی لعل نہرو بہت بیمار ہو گئے۔ اور ۶ فروری کو ان کی طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ اور وہ ہمیشہ کی نیند سو گئے۔ وہ اپنے والد کی لاش الہ آباد لے آئے۔ سول نافرمانی کی تحریک ابھی جاری تھی۔ اگرچہ اس کا زور کم ہو گیا تھا۔ وہ کہتے تھے۔ کہ اگر حکومت سے عارضی تصفیہ ہو گیا۔ تو سول نافرمانی اور عدم ادائے محصول کی تحریک بند ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ عارضی تصفیہ کے چند روز بعد وہ دہلی سے لکھنؤ آ گئے۔ اور سول نافرمانی کو روکنے کی کارروائی شروع کر دی۔ اور اس سلسلہ کے تمام قیدی آہستہ آہستہ رہا کر دیئے گئے ٭

کراچی میں جو کانگرس ہوئی۔ اس کی اہم ترین قرارداد معاہدہ دہلی اور گول میز کانفرنس کے متعلق تھی۔ اس قرارداد کو انہوں نے بھی منظور

کرلیا۔ اور مسٹر گاندھی کی فرمایش پر خود انھوں نے پیش کرکے ہنگامہ خیز تقریر کی۔ دیگر تجاویز پر بھی انھوں نے بہت سی تقریریں کیں۔ معاہدہ دہلی کے بعد ان کی طبیعت ناساز رہتی تھی۔ ڈاکٹروں نے تبدیلی آب و ہوا کا مشورہ دیا اور وہ ایک مہینہ کے لئے سیلون چلے گئے ؛